URDU اُردو

(بارھویں جماعت کے لئے)

STANDARD - XII
(READER AND SUPPLEMENTARY READER)

چھوت چھات ایک غیر انسانی فعل ہے۔
ایک گناہ ہے۔
ایک عظیم جرم ہے۔

ٹمل ناڈو ٹکسٹ بک کارپوریشن

TAMILNADU TEXTBOOK CORPORATION
College Road, Chennai - 600 006.

حصۂ نثر

مرزا غالب کے اخلاق و عادات	خواجہ الطاف حسین حالی	225
عزت	خواجہ حسن نظامی	243
مردہ بدستِ زندہ	مرزہ فرحت اللہ بیگ	257
ڈیجیٹل ٹکنالوجی	پروفیسر سید عبدالوہاب	275
سائنس اور ہمارا معاشرہ	سید محمد اسمٰعیل	290
ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ ؓ	ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن	307
ہماری متحدہ قومیت	شیخ زین العابدین عمری	324

قواعد	337

زبانی یاد کرنے کی نظمیں

حمد	علیم صبا نویدی	1
مرثیہ (شروع کے پانچ بند)	میر انیس	28
اہل بیت کی زندگی	مولانا شبلی نعمانی	76
غزل	میر تقی میر	149
غزل	غالب	161
غزل	جگر مرادآبادی	180

حصۂ نان ڈیٹیل (سرسری مطالعہ)

ابو خان کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	352
نام دیو مالی	مولوی عبدالحق	364
صلیب	ڈاکٹر عابد صفی	370
فقیر	عظیم بیگ چغتائی	383
ارمانوں کی نگری	اے۔امیر النساء	393
دھوپ چھاؤں	ڈاکٹر اعظم کریوی	399

First Edition - 2005

Chairperson
Dr. Syed Sajjad Husain
Professor of Urdu,
University of Madras.

Authors

Syed Mohammed Ismail
Vice Principal,
Govt. Muslim Teachers Training Institute,
Chennai - 600 002.

Dr. Yasmeen Ahmed
Head, Department of Urdu
Presidency College,
Chennai - 600 005.

Shaik Zainul Abideen
P.G. Assistant,
Muslim Hr. Sec. School,
Chennai - 600 005.

Zahid Husain Siddiqui
P.G. Assistant,
Islamiah Hr. Sec. School for Boys
Mel Visharam.

Reviewer
Dr. K. Habeeb Ahmed
Lecturer in Urdu,
University of Madras.

Price : Rs. 25.00

This book has been prepared by The Directorate of School Education on behalf of the Government of Tamilnadu.

This book has been printed on 60 **G.S.M** paper.

Printed by Web Offset at :
Karis Offset Printers, Chennai - 600 029.

قومی ترانہ

جن گن، من ادھنا یک جے ہے
بھارت بھاگیہ وِدھاتا
پنجاب، سندھ، گجرات، مراٹھا
دراوڑ، اتکل، وَنگا
وندھیہ، ہماچل، یمنا، گنگا
اُچ چھل جل دھی ترنگا
تو اشبھ، نامے جاگے
تو اشبھ، آشش مانگے
گاہے توا جے گاتھا
جن گن منگل دایک جے ہے
بھارت بھاگیہ ودھاتا
جے ہے جے ہے جے ہے
جے، جے، جے، جے، ہے

جذباتی یکجہتی کا اقرار

ہندوستان میرا وطن ہے۔ سارے ہندوستانی میرے بھائی بہن ہیں۔ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے اور میں اس کے بھرپور اور گوناگوں ورثے پر نازاں ہوں۔ میں ہمیشہ اس کا اہل بننے میں کوشاں رہوں گا۔ میں اپنے ماں باپ، اساتذہ اور بزرگوں کا احترام کروں گا اور ہر ایک سے اخلاق کے ساتھ پیش آؤں گا۔ میں اپنے وطن اور اس کے باشندوں کے لئے جاں نثاری کا اقرار کرتا ہوں۔ انھیں کی خوش حالی اور فراغت میں میری مسرت پوشدہ ہے۔

تمل زبان کی عظمت

حسینۂ زمین، پرجوش سمندر کو اوڑھے ہوئے ہے۔ خطہ بھارت اس حسینہ کا دمکتا ہوا چہرہ ہے۔ علاقہ دکن اس چہرے کی پروقار ہلال نما پیشانی ہے۔ جس پر دراوڑ کا مہکتا ہوا تلک لگا ہوا ہے!

اے قابل فخر دوشیزۂ تمل! اے دوشیزۂ تمل

تو ہی اس تلک کی خوشبو ہے جس سے سارا جہاں لطف اندوز ہو رہا ہے۔ دنیا کا چپہ چپہ تیری مہکتی خوبیوں سے معطر ہو رہا ہے!

ہم تیری پرشکوہ، سدا بہار جوانی کے جوہر پہ حیراں، بے خودی کے عالم میں تیری عظمت کے گیت گاتے ہیں۔

اے دوشیزۂ تمل زندہ باد! پائندہ باد!

مترجم: سجاد بخاری

پے۔ سندرم پلے ''منون منیم''

پیش لفظ

تعلیم، شائستہ اور مہذب زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ تعلیم کو صوبائی سطح پر رواج دنیا اور اسے بہتر خطوط فکر پر قائم کرنا حکومت کا دائرہ کار ہے۔ تعلیم پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ امیر غریب، مرد عورت سبھی بلا تفریق مذہب وملت تعلیم پاسکتے ہیں۔ حکومتِ ٹمل ناڈو اسی مقصد کے تحت بڑی فیاضی کے ساتھ صوبائی سطح پر تعلیم وتدریس کا وسیع تر جال بچھانے اور اس کو موثر بنانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ کیوں کہ یہ سب جانتے ہیں کہ صوبہ کی مجموعی ترقی کا انحصار صوبہ کی تعلیم یافتہ عوام کے تناسب پر ہے۔ یہ تناسب جتنا بڑھے گا صوبہ اسی قدر سماجی تہذیبی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے بہتر طور پر اپنی شناخت قائم کر سکے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کا موثر بنانے میں اس کا نصاب ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ حکوست ٹمل ناڈو نے اس بابت تعلیمی سال 2005-2006 سے نئے نصاب کی تشکیل اور کتابوں کو ترتیب دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ حکومت کی فراخ دلی کا ضامن ہی نہیں بلکہ اس کے سیکولر کردار کی روشن دلیل بھی ہے جہاں دوسرے اسباق کے لئے نئی نصابی کمیٹیاں اور کتابوں کی ترتیب کے لئے نئے بورڈ تشکیل دئے گئے وہاں اُردو کے لئے بھی نئی نصابی کمیٹی اور کتاب کی ترتیب کے لئے نئے بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ نصاب کی تیاری اور

کتاب کی ترتیب کے دوران اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ طلباء و طالبات کے اندر جدید تقاضوں کے ساتھ زندگی کی روزمرہ ضروریات کو سمجھنے اور پرکھنے کا بہتر شعور پیدا ہو سکے۔ اس ضمن میں اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ ایک طرف طلباء و طالبات میں بارھویں جماعت ہی سے معروضی مطالعے کا ادراک پیدا ہو تو دوسری طرف وہ بولنے اور لکھنے پر بھی قدرت حاصل کرسکیں۔ اس کے لئے ہم نے کتاب میں مشق اور عملی کام کو مضامین پر ترجیح دی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں دلچسپ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جب کہ کتاب کا دوسرا حصہ پُرمغز اور معلوماتی مضامین اور چھ سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ معزز مرتبین کتاب کے بھرپور تعاون اور محنت شاقہ کے نتیجہ میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ ٹکسٹ بک کارپوریشن اور سررشتہ تعلیمات دونوں اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کا بھی جن کی تخلیقات سے یہ کتاب مزیّن ہوئی ہے۔

چیر پرسن

(کمیٹی برائے نصابِ اُردو)

فہرست مضامین

حصہ نظم

		صفحہ نمبر
حمد	علیم صبا نویدی	1
نعت	ابوالبیان حماد	9
دنیا کی بے ثباتی	مرزا شوق لکھنوی	16
مرثیہ	میر انیس	28
قصیدہ	ذوق	41
روٹیاں	نظیر اکبر آبادی	53
مناظرۂ رحم و انصاف	مولانا حالی	64
اہل بیت کی زندگی	مولانا شبلی نعمانی	76
ساقی نامہ	علّامہ اقبال	86
خدا کی نعمتیں	جوش ملیح آبادی	95
خاکِ وطن	جاں نثار اختر	105
مسافر	عزیز تمنائی	115

بے کفن نعش	کمال مدراسی	123
اپنی جنم بھومی	سجاد بخاری	133
رباعیات	امجد حیدرآبادی	142
غزل	میر تقی میر	149
غزل	مومن خان مومن	154
غزل	غالب	161
غزل	فانی بدایونی	167
غزل	شاد عظیم آبادی	173
غزل	جگر مرادآبادی	180
غزل	سید عظمت اللہ سرمدی	186
غزل	کاوش بدری	192
غزل	حبیب اللہ شاہ	198
غزل	بدر جمالی	204
غزل	حکیم محمد یعقوب اسلم	209
غزل	حافظ باقوی	215
غزل	اصغر ویلوری	220

حمد

علیم صبا نویدی

تُو کریم ہے تُو رحیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ
تُو ہی جسم و جاں میں مقیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

تُو ہی عرش وفرش کا نور ہے، تُو ہی پاس نہ کے بھی دُور ہے
تُو جدید ہے، تُو قدیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

تُو ہی وقت وسمت ومکان ہے، تو ہی صبح وشام کی شان ہے
تو ہی بوئے گل ہے، شمیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

تُو ہر ایک دل کی پسند ہے تُو کہیں بھی قید نہ بند ہے
تُو نظر نظر میں مقیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

کہیں چھاؤں تو کہیں دھوپ تو کہیں رنگ تو کہیں روپ تو
تُو ہی روحِ موجِ نسیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

تو ہی پتلیوں کا چراغ ہے، تُو ہی تاجِ دارِ دماغ ہے
تُو ہی نورِ عقلِ سلیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

جو جہانِ غیب و شہود ہیں، ترے آگے سر بہ سجود ہیں
تری ذات سب سے عظیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

مرے فن میں تیرا ظہور ہے، تُو مرا مزاج و شعور ہے
تُو سراپا جانِ علیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

علیم صبا نویدی

علیم صبا نویدی ٹمل ناڈو کے ایک کہنہ مشق شاعر اور لہجہ تراش فن کار ہیں۔ ہم عصر اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک نثر نگار، مورخ، محقق اور نقاد کے بھی مسلّم ہے۔ ایک شہرۂ آفاق شاعر یا فن کار کسی خاص خطّہ زمین کی وراثت نہیں ہوتا اسکی فکر اسکی سوچ اس کا فن اور اس کا پیام عام گیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے علیم صبا نویدی کا شمار بھی ہم عصر اردو ادب کے ان معدود چند فن کاروں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات اور کارناموں نے معتبر و معزز ناقدین ادب سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ادبی دنیا میں ٹملناڈو کے نام کو روشن رکھنے اور از سرنو اسے ادبی نقشے میں شامل کرانے

میں علیم صبا نویدی کے کارناموں کا بھی خاصا دخل ہے۔ علیم کی ذات اوران کے فن کو کسی ایک پیمانۂ ادب سے ناپا نہیں جا سکتا آپ انفرادیت کے حامل جدیدیت کے علم بردار، نئی جہتوں کے متلاشی اور نئے نئے تجربات کو شعر و ادب میں روا رکھنے والے ایک عظیم فن کار ہیں۔ اہلِ ٹملناڈو کو علیم صبا نویدی کی شخصیت اور ان کے ادبی سرمایہ پر جو ناز ہے وہ بے جا نہیں۔

آپ کی پیدائش 1942ء میں بمقام امور، والا جاہ روڈ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدراس میں ہوئی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی-اے کیا۔ مدراسی پورٹ ٹرسٹ میں اسٹور سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے۔ آپ اپنے تحقیقی کاموں میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ ''ٹملناڈو میں اردو ''(انگریزی ترجمہ) اور ٹملناڈو میں نعت گوئی'' ان کی تازہ اشاعتیں ہیں۔ آج کل ایک سہ ماہی رسالہ ''نور جنوب'' بڑی پابندی سے نکال رہے ہیں۔ میرا کیڈمی لکھنو نے آپ کو ''امتیاز میر'' کا اعزاز بخشا۔

معنی اور اشارے

مقیم = قائم-موجود

عرش و فرش	=	آسمان اور زمین
سمت	=	طرف - جانب
آن	=	عزت
بوئے گل	=	پھول کی خوشبو
شمیم	=	نکہت - خوشبو - مہک
موجِ نسیم	=	ہلکی ہلکی خوشبودار ہوا کی لہر
پتلی	=	آنکھ کا سیاہ حصّہ
تاجدارِ دماغ	=	ذہن کا بادشاہ
ظہور	=	ظاہر ہونا
وجہ شعور	=	عقل اور پہچان کا سبب
سراپا	=	سر سے پیر تک

زبان و بیان

خدا کی تعریف میں جو نظم کہی جاتی ہے اسکو حمد کہتے ہیں۔ ''حمد'' کہنے کے لئے چونکہ کوئی خاص ہیئت یا پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ اس لئے شعرائے اکرام نے شاعری کی ہر ہیئت میں حمد کہی ہے۔ ''حمد'' لکھنا یا پڑھنا عبادت میں داخل ہے۔ ''حمد'' میں عموماً شعرائے کرام نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ اس کی ذات و صفات کی بڑائی کے گیت گاتے

ہیں۔ پیشِ نظر ''حمد'' غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے نہایت ہی پُر اثر انداز میں خدا کی تعریف بیان کی ہے۔ مترنم رواں بحر اور منفرد اسلوب بیان کا وہ انوکھا نمونہ پیش کیا ہے کہ کوئی قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ''حمد'' میں استعمال کی گئی ردیف ''تری شان جل جلالہ'' سے قارئین کے دلوں میں ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ اس نظم کی خاص خوبی ہے۔

تراکیب، بندشیں، اور متضاد الفاظ کا وہ جادو جگایا ہے کہ معنی کے طبق روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ متضاد الفاظ کا فنکارانہ استعمال ملاحظہ کیجیے:

تُو ہی عرش و فرش کا نور ہے، تُو ہی پاس رہ کے بھی دُور ہے
تُو جدید ہے، تُو قدیم ہے، تری شان جل جلالہٗ

اسی طرح تراکیب اور بندشوں کا کمال دیکھیے:

تُو ہی روحِ موجِ نسیم ہے تری شان جل جلالہٗ
تُو ہی نورِ عقلِ سلیم ہے تری شان جل جلالہٗ

اس ''حمد'' سے آپ بھی وہ تمام اشعار الگ کیجیے جن میں متضاد الفاظ و تراکیب استعمال ہوئے ہیں۔

''حمد'' کا ہر شعر اپنی جگہ دلکش اور بے مثال ہے خاص طور پر یہ شعر دیکھیے جس میں لفظ کی تکرار سے شاعر نے کس طرح شعری حسن پیدا کر دیا ہے۔

یہ دراصل شاعر کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے:

تُو ہر ایک دل کی پسند ہے تُو کہیں بھی قید نہ بند ہے
تُو نظر نظر میں مقیم ہے، تری شان جلّ جلالہٗ

نیز خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا تذکرہ بھی اس ''حمد'' میں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں موجود ہونے کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل بھی ہے اور دور بھی۔ مقطع کا شعر حاصل حمد ہے۔ شاعر پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کا فن اسکا شعور اور اسکی جان سب کچھ اسی کی دین ہے۔ الفاظ کی نشست، سلاست اور روانی، تراکیب اور صنعتوں کے استعمال سے اس ''حمد'' کی تاثیر اور اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔

غور و فکر

1) ذیل میں دیئے گئے مناسب الفاظ سے مصرعوں کو مکمل کیجئے:

1- تو ہی نورِ عقل .... ہے تری شان جلّ جلالہ

2- تُو ہر .... کی پسند ہے تو کہیں بھی قید نہ بند ہے

3- مرے فن میں تیرا ظہور ہے، تُو مرا مزاج و .... ہے

4- تو ہی پتلیوں کا .... ہے، تُو ہی تاج دارِ دماغ ہے

2) ذیل کے اشعار سے متضاد الفاظ الگ کیجئے:

1- تُو ہی عرش و فرش کا نور ہے، تُو ہی پاس رہ کے بھی دُور ہے
تُو جدید ہے، تُو قدیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

2- تُو ہی وقت و سمت و مکان ہے، تو ہی صبح و شام کی شان ہے
تُو ہی بوئے گل ہے، شمیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

3) ذیل کے مصرعوں سے دو مکمل شعر نکالیے:

1- تُو ہی روحِ موجِ نسیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ
2- تُو ہر ایک دل کی پسند ہے تُو کہیں بھی قید نہ بند ہے
3- مرے فن میں تیرا ظہور ہے، تُو مرا مزاج و شعور ہے
4- تُو نظر نظر میں مقیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ
5- کہیں چھاؤں تو کہیں دھوپ تو کہیں رنگ تو کہیں روپ تو

4) مختصر سوالات:

1- حمد کسے کہتے ہیں؟
2- شاعر نے خدا کو ''تُو جدید ہے تُو قدیم ہے'' کیوں کہا ہے؟
3- کوئی دو لفظی خوبیوں کی نشان دہی کیجئے؟
4- ''تو ہی تاجدار دماغ ہے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5- حمد سے کوئی تین قوافی منتخب کر کے لکھیے؟

5) وضاحتی سوالات:

ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

1- ٹو کریم ہے ٹو رحیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ
ٹو ہی جسم و جاں میں مقیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

2- مرے فن میں تیرا ظہور ہے، ٹو مرا مزاج و شعور ہے
ٹو سراپا جانِ علیم ہے، تری شان جلّ جلا لہٗ

6) تفصیلی سوالات:

1- شاعر نے خدا کی ذات وصفات کی تعریف کن الفاظ میں بیان کی ہے؟ واضح کیجیے؟
2- اس حمد کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
3- علیم صبا نویدی سے متعلق اظہار خیال کیجیے۔

((اس حمد کو زبانی یاد کیجیے))

نعت

ابوالبیان حمّاد

سلام آتا ہے ان کا مجھے پیام کے بعد
مرا پیام پہنچتا ہے جب سلام کے بعد

طلوع صبح سے پہلے خیالِ رخ آیا
ہوا تصور گیسو غروبِ شام کے بعد

ہر اک نظام ہے ناکام و نامراد زبس
حضورؐ آپ کے لائے ہوئے نظام کے بعد

وہ سجدہ گاہِ ملائک وہ جلوہ گاہِ جمال
وہ مسجدِ نبوی مسجدِ حرام کے بعد

صبا کبھی جو مدینے سے ہو گزر تیرا
سنا پیام عقیدت انہیں سلام کے بعد

جو آئی ان کی شریعت تو سب رواج مٹے
نہیں ضرورتِ انجم مہِ تمام کے بعد

مجھے بُلائیں گے دربار خاص میں بھی ضرور
بروزِ حشر وہ فیضانِ لطف عام کے بعد

مقامِ مرد مسلماں ہے جنت الفردوس
کوئی مقام نہیں اور اس مقام کے بعد

حضورؐ آپ کا پیغام ہر جگہ پہنچا
عراق و فارس و مصر و حجاز و شام کے بعد

کلام ایسا کہ جسمیں کوئی کلام نہیں
کلام آپ کا اللہ کے کلام کے بعد

فِدا نہ کیوں ہو محمدؐ کے نام پر حمّاد
انہیں کا نام ہے پیارا خدا کے نام کے بعد

معنی اور اشارے

زبس	=	بہت - ازبس
سجدہ گاہِ ملائک	=	فرشتے سجدہ کرنے کی جگہ
ملائک	=	مَلَک کی جمع - فرشتے

جلوہ گاہِ جمال	=	حُسن کی جلوہ گاہ
شریعت	=	مذہبی قانون-طریقہ
انجم	=	نجم کی جمع-ستارے
مہِ تمام	=	کامل چاند-چودھویں رات کا چاند
بروزحشر	=	قیامت کا دن
فیضانِ لطف عام	=	مہربانی سے سبھی کو فائدہ پہنچنا
فدا	=	قربان-صدقے

ابوالبیان حمّاد:

نام عبدالرحمن خاں، قلمی نام ابوالبیان حمّاد 1924ء میں بمقام مالور پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں 1936ء میں داخلہ لیا اوریہیں سے مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔ یہاں سے فراغت پانے کے بعد لاہورتشریف لے گئے جہاں آپ نے مدرسہ قاسم العلوم میں مولانا احمد علی صاحب سے تفسیر کا درس مکمل کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1946ء سے جامعہ دارالسلام میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کو عربی فارسی وار دو تیسوں زبانوں پر عبور حاصل ہے آپ کا شمار ہندوستان کے جید علمائے دین میں ہوتا ہے۔ ایک پُرگو شاعر کی حیثیت سے

بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شاعری میں آپ کو علامہ شاکر ناٸطی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور تخیل میں بلندی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ملک کے متندر جرائد و رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبول ہوئیں ان میں ''توحید کی حقیقت'' ''تازیانے'' ''بھارت کی تاریخ کا ایک گم شدہ ورق'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ جامعہ سے نکلنے والے ماہنامہ رسالہ ''راہ اعتدال'' کے مدیر بھی رہے ہیں۔

زبان و بیان

اصطلاح شاعری میں نعت ایسے موزوں کلام کو کہتے ہیں جس میں آقائے نامدار سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف باخلاص نیت کی گئی ہو۔ نعت رسول ایک صنف سخن ہی نہیں بلکہ راہ سعادت بھی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ:

نعت کو عشق کی ضرورت ہے
نعت کہنا بڑی سعادت ہے
باوضو ہو کے نعت کہہ لینا
نعت گوئی کی یہ طریقت ہے

نعت گوئی کے لئے جب تک فضل خدا ولطف حبیب خدا نہ ہو نعت کا ایک شعر تو کجا آدھ مصرعہ بھی کہنے کی توفیق نہ ہوگی۔ شعرائے کرام عموماً اس میں حضور کی ذات اقدس ﷺ اور ان کے فضائل وشمائل کا نہایت ادب واحترام سے ذکر کرتے ہیں اور آپ ہی سے اپنے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کے لئے شفاعت طلب کرتے ہیں۔ نعت کے لئے کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں تقریباً ہر شعری صنف میں شاعروں نے نعت کہی ہے۔

حضرت ابوالبیان حماد کی نعت غزل کی ہیئت میں ہے۔ اس میں نعت کی جملہ خوبیاں سمٹ آئی ہیں خلوص وعقیدت کا اظہار بھی ہے اور حضور ﷺ کے نام پر فدا ہونے کا پاکیزہ جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

غور وفکر

1) ذیل کے اشعار کو دیئے گئے مناسب الفاظ سے پورا کیجئے:

(1) سلام آتا ہے ان کا مجھے .... کے بعد (قیام - پیام - انعام)

مرا پیام پہنچتا ہے جب .... کے بعد (کلام - نظام - سلام)

(2) .... کبھی جو مدینے سے ہو گذر تیرا (ادا - صبا - جفا)

سنا پیام .... انہیں سلام کے بعد (نصیحت - مصیبت - عقیدت)

2) ذیل کے الفاظ کا ایک ایک ہم قافیہ لفظ لکھیے:

پیام - جمال - صبا - مدینہ - انجم - حضور

3) ذیل کے شعر کی نثر بنائیے:

مجھے بلائیں گے دربار خاص میں بھی ضرور
بروز حشر وہ فیضانِ لطف عام کے بعد

4) مختصر سوالات:

1- شاعر کو سلام کہاں سے اور کیسے آتا ہے؟
2- خیال رخ اور تصویر گیسو شاعر کو کب آتا ہے؟
3- سجدہ گاہِ ملائک سے شاعر کی مراد کیا ہے؟
4- شاعر کس کے ذریعہ اپنا پیام عقیدت بھیجتا ہے؟
5- بروز حشر شاعر کو کیا توقع ہے؟

5) وضاحتی سوالات:

1- ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

(۱) کلام ایسا کہ جس میں کوئی کلام نہیں
کلام آپ کا اللہ کے کلام کے بعد

(۲) وہ سجدہ گاہِ ملائک وہ جلوہ گاہِ جمال
وہ مسجد نبوی مسجد حرام کے بعد

2 - نعت کا مفہوم بیان کیجئے اور اس صنف سخن کے شرائط کی وضاحت کیجئے۔

6) تفصیلی سوالات:

1) ابوالبیان حماد نے اپنی نعت میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

2) اس نعت کے شعری محاسن پر روشنی ڈالئے۔

دنیا کی بے ثباتی

مرزا شوق لکھنوی

جائے عبرت سَرائے فانی ہے
مُوردِ مرگ نَوجوانی ہے

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شِگوفہ و گل تھے
آج دیکھا، تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بُلبُلوں کا ہُجوم
آج اُس جا، ہے آشِیانۂ بُوم

بات کل کی ہے، نَوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں، نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر، تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مُقیم

کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام
کون سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رُستم، نہ سام باقی ہے
اک فقط نامی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مِل گیا سب اُن کا غُرور

عطرِ مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
اُستخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و فغفُور
باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے اُن کو آسماں و زمیں

ہر گھڑی مُنقلِب زمانہ ہے
یہی دُنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں، نہ کُوہ کن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل و دمن کا پتا

بوے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں: کُلُّ مَن عَلَیهَا فأن

مَوت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

مرزا شوقؔ لکھنوی (۱۷۸۳ء - ۱۸۷۱ء)

تصدیق حسین خان نام، نواب مرزا عرفیت اور شوقؔ تخلص تھا۔ شوقؔ لکھنو کے مشہور طبیبوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم آغا خان اور چچا مرزا علی خان نامور طبیب تھے۔ مرزا علی خان کو دربار اودھ سے حکیم الملک کا خطاب ملا تھا۔ نواب مرزا نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی اس کے بعد اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے تحصیل علم کی اور مختلف علوم میں مہارت بہم پہنچائی۔ علمِ طب پر بھی مکمل دسترس حاصل کی اور طبابت کا خاندانی پیشہ اختیار کیا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں شاہی معالج بھی مقرر ہوئے۔ ان کا انتقال لکھنو میں ہوا۔ شوقؔ ایک وجیہہ

خوش شکل اور خوش وضع انسان تھے ان کے زمانے کا لکھنو شعر وسخن کا مرکز و محور تھا۔ ہر طرف شاعری کی بزم آراستہ تھی۔ ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کے معرکے زوروں پر تھے۔ شعر و شاعری کا یہ ماحول نواب مرزا شوقؔ کی طبیعت پر بھی اثر انداز ہوا اور وہ شوق تخلص کے ساتھ آتشؔ کی شاگردی میں مشق سخن کرنے لگے ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ یہ ان کا میدان نہیں۔ چنانچہ غزل گوئی ترک کر کے مثنوی کی طرف مائل ہوئے۔ مثنوی نگاری میں شوقؔ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اردو شاعری میں وہ مثنوی نگار کی حیثیت ہی سے معروف ہیں۔ ان کی مثنویاں ''فریب عشق'' ''بہار عشق'' اور ''زہر عشق'' کافی مقبول ہوئیں اور ان کی دائمی شہرت کا باعث بنیں۔ ان تینوں مثنویوں میں زہر عشق کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

معنی اور اشارے:

بے ثباتی = ناپائداری۔ قائم نہ رہنا

جائے عبرت = عبرت کی جگہ

سرائے فانی = فنا ہونے والی دنیا

موردِ مرگ = موت کے ٹھہرنے کی جگہ

گور	=	قبر
شگوفہ	=	کلی
خار	=	کانٹے
آشیانۂ بُوم	=	الّو کا گھونسلہ
نوبت ونشان	=	نقارہ اور جھنڈا ۔ طبل وعلم
مکاں گر	=	مکان بنانے والے
مکیں	=	مکان میں رہنے والے
بادشاہ ہفت اقلیم	=	سات ولایتوں کا بادشاہ ساری دنیا کا بادشاہ
زیرِ خاک مقیم	=	زمین کے نیچے پہنچ گئے
بہرام	=	عراق کے ایک بادشاہ کا نام
رستم	=	ایران کے ایک پہلوان کا نام
فرق	=	سر
خودسر	=	غرور
گردش چرخ	=	آسمان کی گردش
اُستخوان	=	ہڈی
قیصر وفغفور	=	روم اور چین کی بادشاہوں کا لقب

نشان قبور	=	قبروں کا نشاں
قبر	+	قبور
کاسۂ سر	=	کھوپڑی ۔ سر کا پیالہ
رشک	=	غیرت
رشک یوسف	=	حضرت یوسفؑ کو رشک آئے
منقلب	=	بدلنے والا ۔ الٹنے والا
شیریں	=	ایران کی ایک معشوق کا نام
کوہ کن	=	ایران کے ایک عاشق کا نام
نل و دمن	=	نل ایک عاشق تھا اور دمن اسکی محبوبہ تھی
بوئے الفت	=	الفت یا محبت کی بو
طائران	=	پرندے
طائر	+	طائران
خوش الحان	=	اچھی آواز والا ۔ سریلی آواز والا
رستگاری	=	چھٹکارا ۔ نجات

زبان و بیان

مثنوی اردو کی معروف اور قدیم صنف شاعری ہے۔ اس میں

چھوٹی بڑی کہانیاں داستانی انداز میں یا کسی عنوان پر خیالات تسلسل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں مثنوی شروع سے آخر تک ایک ہی بحر میں ہوتی ہے مگر ہر شعر کا قافیہ مختلف ہوتا ہے۔ اکثر مثنویوں میں صرف قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ بہت کم مثنویاں ایسی ملیں گی جن میں ردیف کا اہتمام بھی کیا گیا ہو۔

مثنوی کا تعلق چونکہ واقعات اور کردار سے ہوتا ہے۔ اسلئے بیشتر مثنویاں بیانیہ انداز لئے ہوتی ہیں۔ مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہماری سماجی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی تاریخ جھلکتی ہے۔ ''دنیا کی بے ثباتی'' دراصل مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' سے ماخوذ ہے۔ ''زہر عشق'' لکھنو کے رہنے والے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کی داستانِ محبت ہے۔ اس میں عشق ومحبت کی داستان کچھ اس صداقت اور سچائی کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کے اصل ہونے کا گمان گذرتا ہے۔ اس مثنوی کی ہردلعزیزی اور مقبولیت پانے کا راز بھی یہی ہے۔

مثنوی ''زہر عشق'' میں عشق اپنے معراج تک پہنچ تو جاتا ہے لیکن لڑکی کے والدین کو ایک آنکھ نہ بھانے کے سبب وہ لڑکی کو بنارس بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لڑکی یعنی اس کہانی کی ہیروئین کو بنارس جانا سخت ناپسند ٹھہرتا ہے اور وہ جان دینے کی ٹھان لیتی ہے۔ آپ کے نصاب میں شامل ''زہر عشق'' کا یہ اقتباس مثنوی کے اس حصّے سے ماخوذ ہے جس میں ہیروئن دنیا کی بے ثباتی کا

ذکر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کیسے کیسے بادشاہ، نامی گرامی پہلوان اور عاشق و معشوق اس دنیا میں آئے اور فنا ہو گئے۔ اس جہاں میں کوئی باقی نہیں رہتا ایک روز سب کو موت آنی ہے۔

دنیا کی بے ثباتی بیان کرنے میں شوقؔ نے قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ شوق نے لکھنو کی عام روش سے ہٹ کر سیدھا سادہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ بیان میں روانی اور تاثیر بھری ہے لکھنو کی بیگماتی زبان کے بڑے اچھے نمونے اس میں نظر آتے ہیں۔ قصہ اتنے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

غور و فکر

1) ذیل کے اشعار غور سے پڑھیے اور نیچے دیے ہوئے سوالات کے مختصر اور مناسب جواب لکھیے۔

جاے عبرت سَراے فانی ہے — مُورِدِ مرگ نَوجوانی ہے

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شِگوفہ و گل تھے — آج دیکھا، تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجوان تھے جو — صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

1. شاعر نے جائے عبرت کو سرائے فانی کیوں کہا ہے؟
2. اونچے اونچے مکان والوں کا کیا حشر ہوا؟
3. شگوفہ اور گل کی جگہ آج شاعر نے کیا دیکھا؟
4. آشیانۂ بوم سے کیا مراد ہے؟
5. ''صاحب نوبت ونشان'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2) مناسب الفاظ بھرتی کر کے مصرعے مکمل کیجیے۔

1. .... مہ جبیں نہ رہے
2. کون سی گور میں گیا ....
3. آج ہیں .... وہ محتاج
4. .... سے ہلاک ہوئے
5. موت سے کس کو ....

3) مناسب جوڑ لگا کر مصرعہ مکمل کیجیے۔

1.	اب نہ رستم نہ	-	خوش الحان
2.	جو کہ تھے بادشاہ	-	نوجوان تھے جو
3.	بات کل کی ہے	-	جہاں میں حسیں
4.	رشک یوسف جو تھے	-	سام باقی
5.	صبح کو طائران	-	ہفت اقلیم

4) ذیل کے شعر کی نثر بنایئے۔

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

5) مختصر سوالات:

1) جائے عبرت اور سرائے فانی سے کیا مراد ہے؟
2) مرزا شوق کی مثنویوں کے نام لکھئے؟
3) مثنوی کی تعریف بیان کیجئے؟
4) بہرام اور رستم وسام کی کیا گت ہوئی؟
5) فاتحہ کو محتاج کون ہوئے؟
6) بادشاہِ ہفت اقلیم کسے کہتے ہیں؟
7) کس کے کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتے ہیں؟
8) شاعر نے گردش چرخ سے ہلاک ہونا کیوں کہا ہے؟

6) وضاحتی سوالات:

1) ''دنیا کی بے ثباتی'' کا مرکزی خیال واضح کیجئے۔
2) آخری پانچ اشعار کا مفہوم اپنے الفاظ میں لکھئے؟
3) اس شعر کی بحوالہء متن تشریح کیجئے:

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے اُن کو آسماں و زمیں

4) ''عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے'' کی وضاحت کیجئے؟

7) تفصیلی سوالات

1) مثنوی ''دنیا کی بے ثباتی'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے؟

2) مرزا شوق لکھنوی کے طرز اسلوب اور انداز بیان پر اظہار خیال کیجئے؟

مرثیہ

میر انیس

ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں، ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے، نہ صاحب ایسا

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں
اس طرف طبل بجے، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مُصلّی، کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی، کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے، کہ مُمتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے، کہ سجدے کئے تلواروں میں

کیا جوانانِ خوش اَطوار تھے، سُبحان اللہ!

کیا رفیقانِ وَفادار تھے، سُبحان اللہ!

صف در و غازی و جرار تھے، سُبحان اللہ!

زاہد و عابد و اَبرار تھے، سُبحان اللہ!

زن و فرزند سے فُرقت ہوئی، مسکن چھوڑا

مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

جب، فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش اَطوار

کَس کے کمروں کو، بہ صد شوق لگائے ہتھیار

جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہِ عرش وقار

علمِ فوج کو عبّاس نے کھولا اِک بار

دشت میں نکہتِ فردوسِ بریں آنے لگی

عرش تک اُس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

شور میدانوں میں تھا، کہ دِلیرو! نِکلو!

نیزہ بازی کرو، رہواروں کو پھیرو! نِکلو!

نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو! نِکلو!
غازیو! صف سے بڑھو، غول سے شیرو! نِکلو!
رُستمو! دادِ دَغا دو، کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا، حیدرِ کرّار کی اَولاد کا ہے

شور سادات میں تھا، یا شہہِ مرداں مددے!
کعبۂ دیں مددے، قِبلۂ ایماں مددے!
قُوتِ بازُوے پیغمبرِ ذی شاں مددے!
دمِ تائید ہے، اے فخرِ سُلیماں مددے!
تیسرا فاقہ ہے، طاقت میں کمی ہے مَولا!
طلبِ قُوتِ ثابت قدمی ہے مَولا!

سامنے بڑھ کے یکایک صف کُفار آئی
جھوم کر تیرہ گھٹا، تاروں پہ اِک بار آئی
روزِ روشن کے چھپانے کو شبِ تار آئی
تشنہ کاموں کی طرف، تیروں کی بوچھار آئی
ہنس کے، منھ بھائی کا، شاہِ شہدا نے دیکھا
اپنے آقا کو، بہ حسرت، رُفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی، جوش ہے جراروں کو
تیر سب کھاتے ہیں، تولے ہوئے تلواروں کو
مہمانوں کا نہیں پاس، ستم گاروں کو
مصلحت ہو تو رضا دیجئے، غم خواروں کو

روسیاہوں کو ہٹا دیں، کہ بڑھے آتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں تو مُنھ پہ چڑھے آتے ہیں

شہہ نے فرمایا، ہمیں خود ہے شہادت منظور
نہ لڑائی کی ہوس ہے، نہ شُجاعت کا غرور
ان سے منظور نہ تھی جنگ، پر اب ہیں مجبور
خیر! لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ، بے جُرم وقصور

ذبح کرنے کے لئے لشکر ناری آئے
کہیں جلدی، مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پانا تھا، کہ شیروں نے اُڑائے تازی
مثل شہباز گیا، ایک کے بعد اک غازی

واہ رے حرب، خوشا ضرب، زہے جانبازی!
اُڑ گیا ہاتھ، بڑھا جو پئے دست اندازی
تن و سر، لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے
ایک حملے میں، قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے

جس پہ غصے میں گئے، صید پہ شہباز گرا
یہ کماں کٹ کے گری، وہ قدر انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے، تو ممتاز گرا
نہ اٹھا پھر کبھی، جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منھ کٹ گئے، سر اُڑ گئے، جی چھوٹ گئے
مورچے ہوگئے پامال، پرے ٹوٹ گئے

یہی ہنگامہ رہا صُبح سے تا وقتِ زوال
لاش پر لاش گری، بھر گیا میدانِ قتال
مورچے سب تہ و بالا تھے، پرے سب پامال
سُرخ رو، خلق سے اٹھے اسد اللہ کے لال
کھیت ایسے بھی، کسی فوج میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا، سب یہی سمجھے، کہ علی لڑتے ہیں

میر ببر علی انیسؔ (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء)

ببر علی نام، انیس تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انیسؔ کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے پردادا میر غلام حسین ضاحکؔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے بیٹے میر حسنؔ کے ساتھ دہلی چھوڑ کر فیض آباد چلے آئے تھے۔ میر انیسؔ نے اپنے والد میر خلیقؔ کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت پائی۔

انیسؔ نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں کو ایک اعلا فن کا درجہ دیا۔ مرثیے میں انھوں نے شاعری اور فن کاری کے ایسے عناصر شامل کیے جو اُن سے پہلے نظر نہیں آتے۔ مسدس کی ہیئت جو مرثیے کے لیے مقبول ہو رہی تھی، اسے انیسؔ اور دبیرؔ نے استحکام بخشا۔ ان دونوں شعرا نے اجزائے مرثیہ کو بڑی خوبی کے ساتھ نباہا اور ان کے ذریعے نئے نئے مضامین و اسالیب سے مرثیے کو مالا مال کیا۔ اس طرح مرثیہ محض شہادت کے موضوع تک محدود نہ رہا اور ایک ایسی وسیع اور پہلو دار نظم کی حیثیت اختیار کر گیا جس میں رزم و بزم، واقعہ نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری اخلاق و فضائل پوری آب و تاب اور حسنِ بیان کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اُن میں غزل کا سوز و گداز، مثنوی کا لطفِ بیان، قصیدے کی شان و شکوہ اور ڈرامے کا منظر و مکالمہ سب کچھ موجود ہے۔

معنی اور اشارے

ماجرا	=	واردات-روئداد-سرگذشت
تشنہ کاموں	=	تشنہ کام کی جمع - پیاسا
ہمتا	=	برابر-مثل-مانند-نظیر
مصاحب	=	ساتھی
سجادہ	=	جانماز- وہ دری یا کپڑا جو نماز پڑھنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔
مصلّی	=	نماز پڑھنے والا-نمازی
خوش اطوار	=	اچھی عادتیں
ابرار	=	بَر کی جمع = نیک- پرہیز گار لوگ
صفدر	=	صفوں کو چیرنے والا
جرار	=	لغوی معنی ہیں کھینچنے والا - اردو میں جری یا بہادر شخص کے لئے مستعمل ہے۔
پھریرے	=	علم یا جھنڈے کا کپڑا
رہواروں	=	رہوار کی جمع = گھوڑے
وَغا	=	جنگ-لڑائی-ہنگامہ
سادات	=	سیّد- وہ لوگ جو حضرت علی کی اولاد اور حضرت فاطمہ کے بطن سے ہیں۔

ثابت قدمی = مستقل مزاجی - استقلال

روسیاہوں = روسیاہ کی جمع = گناہ گار - بدکردار - بداطوار لوگ

حرب = لڑائی - جنگ

پاس = لحاظ

ستم گاروں = ستم گار کی جمع = تکلیف دینے والے - ستانے والے

اُڑائے تازی = گھوڑے دوڑائے

زبان و بیان

مرثیہ لفظ ''رثاء'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا۔ اصلاً مرثیہ سے مراد ایسی نظم ہوتی ہے جس میں کسی مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اس کی موت پر اظہار رنج و غم کیا جائے لیکن اردو میں مرثیے کا ایک خاص مفہوم متعین ہو گیا ہے یعنی مرثیہ صرف اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے۔ باقی تمام لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے مثلاً حالی کا ''مرثیۂ غالب'' اقبال کا مرثیۂ داغ وغیرہ۔

زیرنظر مرثیہ میر انیسؔ کے قلم کا وہ شاہکار ہے جس میں واقعہ نگاری منظر نگاری، جذبات نگاری کے ساتھ حضرت امام حسین اور ان کے جاں نثاروں کے اخلاق و فضائل اور ایثار و قربانی کا منظر پوری آب تاب سے کھینچا گیا ہے۔

اس مرثیہ کا مرکزی خیال صبح شہادت کا بیان ہے۔ انیسؔ نے اس صبح شہادت کا منظر اتنے پُر تاثیر الفاظ میں کھینچا ہے کہ قاری پر حضرت امام حسین اور ان کے جاں نثاروں کی تشنہ کامی، عبادت و ریاضت اور اطاعت و شجاعت کے سارے احوال روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

صبح شہادت، کربلا کے میدان میں یزیدی لشکر سے مقابلے کے لئے حُسینی فوج کے سالار و سردار حضرت امام حسینؑ اپنی مختصر فوج کے ساتھ کمر بستہ ہوتے ہیں۔

صبح کی نماز حضرت امام حسینؑ کی امامت میں ادا کی جاتی ہے۔ حسینی فوج میں حضرت امامِ دو جہاں کے رشتہ دار بھائی بھانجے، بھتیجے، بہنیں اور بیبیاں شامل تھیں۔ ان میں بوڑھے بھی تھے جوان بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بچے بھی تھے اور نو مولود بھی۔ فریضۂ نماز سے فارغ ہو کر حسینی لشکر میدان کربلا میں جب اسباب جنگ سے لیس ہو کر آتا ہے تو یزیدی لشکر کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ لشکر پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ تیر برسائے جاتے ہیں تلوار کی کاٹ سے تن و سر جدا ہونے

لگتے ہیں۔ مورچے پامال ہو جاتے ہیں۔ میدان کربلا میں لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے لیکن حسینی لشکر کا ہر فرد ثابت قدم ہو کر یزیدی فوج کا مقابلہ کرتا ہے۔ جنگ شام تک جاری رہتی ہے آخر میں حضرت امام حسین اپنی شجاعت و بہادری کا ایسا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ تن تنہا یزیدی لشکر کے سینکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ آپ کی بہادری کو دیکھ کر یزیدی لشکر کا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ شیر خدا حضرت علی لڑ رہے ہیں۔

مرثیہ کے تیسرے بند کو غور سے پڑھئے مصرعے میں ''جوانان خوش اطوار'' کا ذکر کرنے کے بعد تیسرے اور چوتھے مصرعے میں ان کی صفات کا ذکر ترتیب وار کیا گیا ہے۔ جیسے صفدر، غازی، جرار، زاهد، عابد، ابرار۔ کلام میں ممدوح کی صفات ترتیب کے ساتھ بیان کرنا ''صنعت تنسیق الصفات'' ہے۔ یہ معنوی صنعت ہے۔ خیال رہے ''صفات'' کے کلمات کے الفاظ دو سے زائد ہونے چاہئیں۔

حضرت عباس۔ حضرت امام حسین کے چھوٹے بھائی جو حضرت علیؓ کی دوسری زوجہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ کربلا میں حسینی لشکر کا علم لے کر سب سے آگے چلتے تھے اس لئے انہیں علم بردار عباس بھی کہتے ہیں۔ فنونِ جنگ کے ماہر، نہایت دلیر اور قد آور تھے بتّیس سال کی عمر میں میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

غور و فکر:

1- ذیل کے اشعار پڑھیئے اور نیچے دیئے ہوئے سوالات کے مختصر جواب لکھیے:

(الف) تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں

(1) تشنہ کاموں اور جاں نثاروں سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(ب) صف در و غازی و جرار تھے سبحان اللہ
زاھد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ

(2) اس شعر میں کن لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں؟

(ج) جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش اطوار
کس کے کمروں کو بہ صد شوق لگائے ہتھیار

(3) کونسا فریضہ ادا کیا؟ اور پھر کیا کیا؟

2- جوڑ لگایئے

الفاظ		معنی اور اشارے
مصاحب	=	جنگ-لڑائی
تشنہ کامی	=	شکار

ہمتا = پرہیزگار لوگ

ابرار = مثل-مانند-نظیر

صید = پیاسا

حرب = ساتھی

3- ذیل کے شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجئے:

منھ کٹ گئے ہاتھ جی چھوٹ گئے سر اڑ گئے

ہو گئے پامال مورچے ٹوٹ گئے پرے

4- دیے گئے الفاظ سے شعر پورا کیجئے:

(وقار - گھوڑے - خوش اطوار - علم - بار - وفادا

1) کیا جوانانِ .... تھے سبحان اللہ

کیا رفیقان .... تھے سبحان اللہ

2) جلوہ فرما ہوئے .... پہ شہِ عرش ....

..........فوج کو عباس نے کھولا اک ....

5) مختصر سوالات:

1) مرثیہ کی تعریف کیجئے؟

2) شخصی مرثیہ کسے کہتے ہیں؟

3) امام دو جہاں سجادۂ طاعت پر آئے تو کیا ہوا؟

4) دشت میں کیا آنے لگی اور عرش تک کیا جانے لگی؟

5) سادات میں کیا شور مچا؟

6) شبہ نے کیا فرمایا؟

6) وضاحتی سوالات:

ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجیے

1- زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

2- جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے نہ صاحب ایسا

3- جس پہ غصے میں گئے صید پہ شہباز گرا
یہ کماں کٹ کے گری وہ قدر انداز گرا

7) تفصیلی سوالات:

1- اردو مرثیہ پر میر انیس کے کیا احسانات ہیں؟ تفصیل کے ساتھ لکھئے۔

2- دوسرے بند کی وضاحت کیجئے؟

3- دسویں بند میں کیا منظر پیش کیا گیا ہے۔ واضح کیجئے؟

4- اس مرثیہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے؟

قصیدہ

ذوقؔ

زہے نشاط! اگر کیجئے اُسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے، تحریرِ نغمہ، جاے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑئے، تو پیدا ہو
نفس کے تار سے، آوازِ خوش تراز بم وزیر

ہُوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش ق
کلید قُفلِ دل تنگ و خاطر دل گیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ، درِ ہزار سُخن
چمن میں، موج تبسّم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہواے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو، غنچۂ منقارِ بُلبُل تصویر

ہوا پہ دوڑتا ہے، اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست، بے زنجیر

نہ خارِ دشت ہی، نرمی میں خواب مخمل ہے
ہر ایک تارِ رگ سنگ بھی، ہے تارِ حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت، کہ دودِ گُلخن بھی
برستا اُٹھے ہے، آتش سے مثل ابر مطیر

یہ آیا جوش میں، بارانِ رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں، سنگِ یدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گُل، ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم، گہر کی طرح خوش آب
ہر اک گہر، گہرِ شب چراغ، پُر تنویر

جہاتِ ستہ سے، بزم جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جمِ غفیر

دیا ہے رنج کو دھو، تیرے غسلِ صحت نے
ضمیر خلق سے، آئے بادشاہ پاک ضمیر

رہا نہ کوئی گرفتارِ رنج، عالم میں ۔۔۔ چھٹے جو تیرے تصدّق میں، مجرمانِ اسیر

یہ وہ خوشی ہے، کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز ۔۔۔ بلال بست و نُہم کی طرح بدل کے حقیر

شہنشہا! وہ تری روشنی رائے مُنیر ۔۔۔ عقول عشرہ کے انوار جس کے عُشرِ عشیر

جو ہیں نکات و معانی، بشر کی فہم سے دوُر ۔۔۔ وہ تیرے ذہن میں موجود، سب قلیل و کثیر

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں، تو یہ ۔۔۔ نہ اپنا یاد ہے احساں، نہ اور کی تقصیر

مجال کیا؟ کہ ترے عہد میں شرر کی طرح ۔۔۔ اٹھائیں سر کو شرارت سے، سرکشانِ شریر

ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خوں ریزی ۔۔۔ لڑائیوں میں، کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر

ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں، یہ زور ۔۔۔ ق ۔۔۔ جو کھینچے اک روش خط مُنحنی وہ لکیر

تو اس سے ایسی ہوں اشکالِ ہندسی پیدا ۔۔۔ مٹا دے، دیکھ کے اقلیدس، اپنی سب تحریر

وہ روشنی ترے خط میں، کہ ابن مُقلہ اگر ۔۔۔ لگائے آنکھوں سے، سرمے کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نورِ بصارت، کہ پڑھ لے حرف بہ حرف ۔۔۔ جو ہووے، لوحِ جبیں پر نوشتۂ تقدیر

ترا سمند ہے وہ تیز رو، کہ وقتِ خرام ۔۔۔ نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی، نہ اس کی نظیر

کہ سیرگاہ ہے اس کی، تو راہِ یک روزہ ۔۔۔ اور اُس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہ مسیر

ترے جو فیل کی تعریف، خسروا! لکھوں ۔۔۔ کروں حکایت شیریں، کوہ کن تحریر

کہ فیل کوہ، کجک تیشہ، فیل باں فرہاد ۔۔۔ وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفی آفتاب، عالم میں ۔۔۔ خطِ شعاع سے اس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابو ظفرؔ، شہِ والا گہر، بہادرؔ شہ
سراجِ دینِ نبی، سایۂ خدائے قدیر

نہ ہے ثنا کے لئے تیرے، اختتام و تمام
یہ ہے دُعا کے لئے تیری، انتہا و اخیر

مگر، یہ ذوقؔ ثنا سنج مدح خواں تیرا
غلام، پیر کہن سال، اک فقیرِ حقیر

کرے ہے دل سے دُعا، یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحم خُدا، دُعائے فقیر

الٰہی! آب پہ تا ہوز میں، زمین کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک، اور فلک کو ہو تدویر

عطا کرے تُجھے عالم میں، قادرِ قیوم
بہ جاہ و دولت و اقبال و عزّت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل
سپاہِ وافر و مُلکِ وسیع و گنج خطیر

شیخ محمد ابراھیم ذوقؔ (۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء)

شیخ محمد ابراھیم نام اور ذوقؔ تخلص تھا۔ ذوقؔ نے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے حاصل کی۔ اسی زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اپنے وقت کے مستند استاد شاہ نصیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ مشق سخن اور اپنی ذہانت وعلمیت کے باعث وہ بہت کم عمری میں استادی کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی استادی کا فخر بھی حاصل ہوا اور خاقانیِ ہند اور ملک الشعراء کے خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ بادشاہ کی سرپرستی میں ذوقؔ کی زندگی آرام واطمینان سے بسر ہوئی۔

ذوقؔ کو موسیقی اور علم نجوم سے کافی دلچسپی تھی عربی و فارسی کے عالم تھے مختلف علوم مثلاً فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث اور تاریخ پر عبور حاصل تھا لیکن ان کا اصل کمال فن شعر گوئی کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ اس کی بدولت انہیں فکر معاش سے آزادی نصیب ہوئی اور یہی فن ان کی دائمی عزت و اہمیت کا وسیلہ ثابت ہوا۔

ذوقؔ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن قصیدہ ان کا اصل میدان ہے اس میں صرف سودا ان سے برتر ہیں۔ اردو کا دوسرا کوئی شاعر قصیدہ نگاری میں ذوقؔ کا ہم پلہ نہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں میں شوکت الفاظ، بلند خیالی اور معنی آفرینی کے ساتھ اس صنف کے تمام مطالبات کا حق ادا کیا ہے۔ غزل گوئی میں بھی ذوق کا ایک خاص مقام ہے۔ زبان کی صفائی، بیان کی سلاست، بندش چستی اور محاورات کی برجستگی ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

معنی اور اشارے

زہے	=	واہ واہ - شاباش - مرحبا
نشاط	=	خوشی - شادمانی - فرحت
زہے نشاط	=	واہ ری خوشی
عیاں	=	ظاہر

خامہ	=	قلم
صریر	=	قلم چلنے کی آواز
نفس	=	سانس
بم وزیر	=	اونچا نیچا سُر
کلیدِ قفل	=	قفل کی چابی
وا	=	کھلا ہوا
انبساط	=	خوشی
منقار	=	چونچ
پیل مست	=	مست ہاتھی
تار حریر	=	ریشم کی تار
طراوت	=	ٹھنڈک - تازگی
دُور	=	دھواں
ابر مطیر	=	برسنے والا بادل
باران	=	بارش
سنگِ یدہ	=	مدد یا حفاظت کرنے والا پتھر
بہشت نظیر	=	جنت کی مثال
جہات	=	جہت کی جمع = سمت - رخ
ستّہ	=	چھ

جہات ستہ	=	چھ سمتیں یا رُخ
جم غفیر	=	زبردست ہجوم
مجرمان	=	مجرم کی جمع
مجرمان اسیر	=	قید کئے گئے مجرم
بِست	=	بیس
نُہم	=	نو یا نواں
عقول	=	عقل کی جمع
عشرہ	=	دس
عُشرِ عشیر	=	دسویں حصّہ کا دسواں حصّہ - بہت تھوڑا سا
نکات	=	نکتہ کی جمع
قلیل و کثیر	=	کم اور زیادہ
سہو	=	غلطی
تقصیر	=	غلطی
سرکشاں	=	سرکش کی جمع
سرکشان شریر	=	شرارت کرنے والے مغرور یا گھمنڈ یلوگ
نسق	=	انتظام - قاعدہ - دستور
نکسیر	=	ناک سے خون گرنا
پھوٹتی نہیں نکسیر	=	ذرا سا صدمہ نہیں پہنچاتا
اقلیدس	=	ریاضی اور ہندسے کا علم - ایک یونانی حکیم کا نام

نوشتۂ تقدیر	=	تقدیر کا لکھا
سمند	=	زردی مائل گھوڑا
ثناسنج	=	تعریف کرنے والا
پیر کہن سال	=	بڑی عمر والا بوڑھا
تدویر	=	گول بنانا
گنجِ خطیر	=	بہت خزانہ

زبان و بیان

قصیدہ اردو شاعری کی قدیم اور مشہور صنف سخن ہے۔ جس میں کسی بلند مرتبہ یا باوقار شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ صنف عربی اور فارسی سے ہوتے ہوئے اردو تک پہنچی ہے۔

اصطلاح شاعری میں قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں بادشاہِ وقت یا نواب یا حکمراں یا امیر و وزیر کی مدح یا ہجو کی گئی ہو۔ غزل کی طرح قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قصیدے میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہو سکتے ہیں۔ غزل کے برعکس یہ زائد مطلعے عموماً اشعار کے بیچ میں آتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ جہاں تک

موضوع کا تعلق ہے۔ قصیدے میں عام طور پر مدح یا ذم کے ساتھ پند و وعظ یا مختلف حالات و کیفیات کا بیان بھی کیا جاتا ہے۔ غزل کی طرح قصیدہ بھی ہر بحر میں لکھا جا سکتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے قصیدے کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(الف) خطابیہ:۔

جب قصیدہ براہ راست مدح یا ذم سے شروع ہوتا ہے تو خطابیہ کہلاتا ہے۔

(ب) تمہیدیہ:۔

جب قصیدہ براہ راست اصل موضوع سے شروع نہیں ہوتا اور اس میں تمہید کے طور پر کچھ اشعار شامل ہوتے ہیں تو ایسے قصیدے کو تمہیدیہ قصیدہ کہتے ہیں۔

موضوع کی مناسبت سے قصائد مدحیہ، ہجویہ، حمدیہ، نعتیہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیئے جاتے ہیں۔

ذوقؔ کا یہ قصیدہ مدحیہ قصیدوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں ذوقؔ نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی شان میں زبان و بیان کا وہ جادو جگایا ہے کہ قصیدہ سراپا مدح سرائی کا ایک گلشن معلوم ہوتا ہے۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفرؔ کی شان میں مدح سرائی کرنا خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ زبان سے

ذکر چھڑتے ہی تار نفس میں زیر و بم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چمن میں آپ کے نام سے غنچوں کی زبان پر تبسم کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ابر سیاہ ایک مست ہاتھی کی طرح ہوا میں دوڑنے لگتا ہے۔ حتیٰ کے جنگل کے کانٹے بھی نرمی میں مخمل جیسے نرم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہوا میں طراوت کا یہ عالم کہ گلخن کا دھواں بھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آگ سے برسنے والے بادل برسنے کے لئے پر تول رہے ہیں ظفر اللہ کی خاص رحمت سے اس قدر سرفراز ہیں کہ ان کے دور میں پتھر بھی گویا حفاظت اور پاسداری کا نمونہ بن گیا ہے۔ ذوق اپنے اس پورے قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کی تقریباً تمام صفات کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کر دیا ہے۔ آخر میں ذوق نہایت انکساری اور لجاجت کے ساتھ حاکم وقت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے عزت و توقیر، درازی عمر، ملک کی توسیع اور بے شمار دولت سے مالا مال کرنے کی دل سے دعا کرتے ہیں۔

زبان و بیان اور الفاظ کا انتخاب ممدوح کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ قصیدے میں ایک گھن گھرج سی سنائی دیتی ہے۔ لفظوں کی ترکیب اور طرز اسلوب کی دلکشی کا احساس قصیدے کے ہر شعر میں ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی خوبصورت استعمال سے ذوق نے اپنے قصیدے کو مزین بھی کیا ہے اور شعری صنعتوں سے قصیدے کا حُسن اور بھی نمایاں ہو گیا ہے۔

غور وفکر

1) ذیل کے اشعار کو غور سے پڑھیے اور نیچے دیئے ہوئے سوالوں کے جواب لکھیے:

زباں سے ذکر اگر چھیڑے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوش تراز بم وزیر

شہنشاہ وہ تری روشنی رائے منیر
عُقولِ عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم
بہ جاہ دولت و اقبال و عزت و توقیر

1- شاعر زبان سے کس کا ذکر چھیڑنے کی بات کرتا ہے؟
2- ذکر چھیڑیں تو کیا کیفیت پیدا ہوگی؟
3- شہنشاہ کی رائے کتنی عقلوں پر بھاری ہے؟
4- شاعر بادشاہ کے لئے کیا دعا کرتا ہے؟

2) ذیل کے اشعار سے مترادف الفاظ الگ کیجیے:

1- نہ ہے ثنا کے لئے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

شہنشاہ کی سیر گاہ کیسی ہے؟

توضیحی سوالات:

ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجئے:

۱- ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغر عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

۲- تو ہو یہ نور بصارت کہ پڑھ لے حرف بہ حرف
جو ہو وے لوح جبیں پر نوشتۂ تقدیر

بادشاہ کے ہاتھی کی تعریف شاعر کس طرح کرتا ہے اور خود بادشاہ کے لئے کیا دعا مانگتا ہے؟

تفصیلی سوالات:

ذوقؔ کی قصیدہ نگاری سے متعلق اظہار خیال کیجئے؟

ذوقؔ نے بہادر شاہ کی مدح کن الفاظ میں اور کس طرح کی ہے۔ مثالوں کے ساتھ لکھئے؟

اس قصیدہ کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جس جا پہ ہانڈی، چولھا، توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب، نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے توے، تنور کا جس جا زباں پہ نام
یا چکّی چولھے کا جہاں گل زار ہو تمام
واں سر جُھکا کے کیجئے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انہی مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

اِن روٹیوں کے نُور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے، چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اُس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بُجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامِل فقیر سے
''یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے؟''
وہ سُن کے بولا ''بابا! خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں''

پھر پوچھا اُس نے ''کہئے یہ ہے دل کا نور کیا؟
اس کے مشاہدے میں ہے کُھلتا ظہور کیا؟''
وہ بولا سن کے ''تیرا گیا ہے شعور کیا!
کشفُ القلوب اور یہ کشفُ القبور کیا؟
جتنے ہیں کشف، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں''

روٹی جب آئی پیٹ میں، سو قند کُھل گئے
گل زار پھولے آنکھوں میں، اور عیش تُل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈُھل گئے
چودہ طبق کے، جتنے تھے، سب بھید کُھل گئے
یہ کشف، یہ کمال، دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو، تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے، غریب دل کی، خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

وہ جن کے آگے مال پوے بھر کے تھال ہیں
پوری بھگت اُنہی کی، وہ صاحب کے لال ہیں
وہ جن کے آگے روغنی اور شیر مال ہیں
عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
پکی پکائی اب جنہیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں، روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں، روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں، روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں، روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ، قواعد دِکھا دِکھا
اسوار ناچے، گھوڑے کو کاوا لگا لگا
گھنگرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے ناچتا
اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بہ جا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہے
نا دشمنی و دوستی، نا تُند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے
سب کوئی ہے اُسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے
نوکر، نفر، غلام، بناتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر
روکھی بھی روٹی، حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہووے، موٹی، خمیری ہو، یا فطیر
گیہوں، جوار، باجرے کی، جیسی ہو نظیر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۲ء - ۱۸۳۰ء)

ولی محمد نظیر اکبر آبادی کے سن پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ تاریخِ ادب میں عموماً صرف یہ اشارہ ملتا ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی میں پیدا ہوئے۔ بعض محققین نے اُن کا سنِ پیدائش 1732ء لکھا ہے اور بعض نے 1739ء اور 1740ء لکھا ہے۔ نظیر کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر انقلاباتِ زمانہ سے تنگ آکر احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت دلی چھوڑ کر آگرہ آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد کاظم اور ملا ولی سے حاصل کی۔ نظیر رنگین مزاج اور آزاد طبع واقع ہوئے تھے۔ چوسر، پچیسی اور شطرنج کے ماہر تھے۔ پتنگ بازی اور لال لڑانے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ہندوستانی تہواروں اور میلوں ٹھیلوں میں نہایت دلچسپی تھی۔ ہندوستان کی مشترک تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے۔ اٹھائیس سال کی عمر

تک آزادانہ زندگی بسر کی۔ وہ پیشے کے لحاظ سے مدرس تھے۔ تمام عمر معلّمی اور شاعری کرتے رہے۔ 1830ء میں تقریباً اٹھانوے سال کی عمر میں فالج گرنے سے وفات ہوئی۔

نظیر کی آزادہ روی اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ راہ چلتے نظمیں کہتے، لوگوں کی فرمائش پر غزل، خمسہ، مسدس اور مثلث کہتے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ درباروں سے وابستگی نہ تھی۔ ہر طبقے کا فرد ان کے حلقے کا رکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عوامی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ نظیر نے اشاروں اور کنایوں میں تصوّف کے مضامین بھی اپنی کچھ نظموں میں بیان کیے ہیں۔ نظیر چونکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے، اس لیے یہ بات فطری تھی کہ انھوں نے ہندوستانی معاشرت، رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور موسموں پر نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اسلام کے بعض مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ رام، کرشن اور گرونانک پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ نظیر نے اپنی نظموں میں عام زبان اور روزمرّہ کی بول چال کا لہجہ استعمال کیا ہے جس سے ان میں ایک فطری انداز پیدا ہو گیا ہے۔ عوامی موضوعات پر اظہارِ خیال کرنے اور عام زبان استعمال کرنے کی وجہ سے نظیر عوام کے شاعر کہے جاتے ہیں۔

معنی اور اشارے:

تنور	=	روٹی پکانے کا مقام
ظہور	=	ظاہر ہونا
ڈنڈوت	=	ماتھا ٹیکنا۔ زمین پر سر رکھنا۔ سجدہ کرنا
پُور پُور	=	پوری طرح بھرا ہوا
مہر و ماہ	=	سورج اور چاند
کاہے کے	=	کس چیز کے
مشاہدے	=	مشاہدہ - دیکھنا صوفیوں کی اصلاح میں نورِ الٰہی کا نظارہ
کشف	=	ظاہر کرنا۔ کھولنا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں وہ درجہ جس پر پہنچ کر غیب کے اسرار ظاہر ہو جائیں
کشف القلوب	=	دلوں کے حالات معلوم ہو جانا
کشف القبور	=	صوفیوں کا وہ درجہ جس میں ان کو مردے کی قبر کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں
چودہ طبق	=	زمین اور آسمان کی سات سات پرتیں
مال پوے	=	گھی میں تلی ہوئی ایک طرح کی میٹھی پوری
تھال	=	تھالی۔ برتن

روغنی	=	گھی یا تیل میں بنی ہوئی
پیادہ	=	پیدل چلنے والا
پیک	=	قاصد۔ پیغام لانے والا
نفر	=	خادم
فطیر	=	تازہ گندھا ہوا آٹا

زبان و بیان:

یہ نظم نظیر اکبر آبادی کے منفرد طرز اسلوب اور انداز بیان کی آئینہ دار ہے روٹی کی اہمیت اور خصوصیت اس کا موضوع ہے۔ کل بارہ بندوں پر مشتمل یہ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے۔ ''مخمس'' اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔ نظم کا مرکزی خیال اگر چہ روٹی کی اہمیت کے اظہار بیان پر مشتمل ہے لیکن اس کے ہر بند سے نظیر کے گہرے مشاہدے کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ روٹی سے جڑی تمام لوازمات کو نظیر نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم میں واضح کر دیا ہے۔

اس نظم میں روٹی کی خصوصیت اور اہمیت ظاہر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ جب آدمی کا پیٹ روٹیوں سے بھرا ہوتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور خالی پیٹ آدمی پر کیا گذرتی ہے بھوکے آدمی کے لئے روٹی ہی

سب سے بڑی نعمت ہے۔ روٹی کے لئے ہی لوگ کشف اور کمال دکھاتے ہیں۔ روٹی ہی آدمی کو نوکر اور غلام بناتی ہے۔ اور روٹی ہی سو طرح کے ناچ دکھاتی ہے۔ روٹی حاصل کرنا ہی بھوکے آدمی کی پہلی خواہش ہوتی ہے۔ خالی پیٹ نہ میلے اچھے لگتے ہیں اور نہ باغ کی تفریح میں مزہ آتا ہے۔ اسی لئے نظیر نے کہا ہے کہ بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن باقی نہیں رہتی پیٹ بھرنے کے بعد ہی اسے دوسری چیزوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ روٹی کے خاطر آدمی سو سو جتن کرتا ہے۔ ''سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے'' یہ کہاوت ہے اس کہاوت کی اصل صورت یہ ہے جس ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی۔ مطلب یہ کہ لوگ اسی کی بات مانتے ہیں جس سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

غور و فکر

1) مناسب جوڑ لگا کر مصرعے مکمل کیجئے:

.1	چولھے کے آگے آنچ جو	-	ہمارا تو ہے خمیر
.2	واں سر جھکا کے کیجئے	-	بھوکے بھجن نہ ہو
.3	وہ سن کے بولا بابا	-	جلتی حضور ہے
.4	سچ ہے کہا کسی نے کہ	-	خدا تجھ کو خیر دے
.5	روٹی کا اب ازل سے	-	ڈنڈوت اور سلام

2) ذیل کے شعر کی نثر بنائیے:

اِن روٹیوں کے نُور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے، چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور

3) ذیل کے شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجیے:

نہ پیٹ میں روٹی ہوتو کچھ جتن پھر نہ ہو
سیر میلے کی باغ و چمن خواہش نہ ہو

4) قوسین میں دیے گئے الفاظ سے مصرعے مکمل کیجیے:

1. پہلے انہی .... میں آتی ہیں روٹیاں [محلوں - مکانوں - ایوانوں]
2. وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے .... کیا [حضور - ظہور - شعور]
3. عارف وہی ہیں اور وہی صاحب .... ہیں [حلال - ملال - کمال]
4. روٹی نہ پیٹ میں ہوتو پھر کچھ .... نہ ہو [لگن - جتن - وطن]

5) مختصر سوالات:

1) نظیر کو عوامی شاعر کیوں کہا جاتا ہے۔
2) خالق کی قدرتوں کا ظہور کس جگہ ہوتا ہے۔
3) کامل فقیر سے کسی نے کیا پوچھا اور فقیر نے کیا جواب دیا۔
4) روٹی کے واسطے کسی کے کپڑے لال اور کسی کے لمبے بال کیوں ہیں۔

5) روٹی پیٹ میں نہ ہو تو آدمی پر کیا گذرتی ہے؟

6) وضاحتی سوالات:

1) پانچویں بند کی وضاحت کیجئے۔

2) پیادہ اور سوار روٹی کے لئے کیا کیا منظر دکھاتے ہیں۔

3) اس نظم کا کون سا بند آپ کو زیادہ پسند ہے۔ اور کیوں؟

7) تفصیلی سوالات:

1) بحوالہ متن ذیل کے اشعار کی تشریح کیجئے:

(۱) واں سر جھکا کے کیجئے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام

(۲) دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے
چودہ طبق کے، جتنے تھے، سب بھید کھل گئے

2) اس نظم کا مرکزی خیال واضح کیجئے:

3) نظیر کے طرز اسلوب اور انداز بیان پر اظہار خیال کیجئے:

مناظرۂ رحم و انصاف

مولانا حالیؔ

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا
کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا

نیک نامی سے ترے سخت تحیّر ہے ہمیں
ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں

اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تونے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تونے

تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سر تن سے جدا
اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مَسکن سے جدا

جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست
یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر بھی مجھ سے بیزار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا

حق کے الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی میں یگانہ ہوں میں

میں ہر اک دور میں ہو جاتا ہوں انسان کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

تجھ سے ہوتے اگر اے عدل جہاں میں دو چار
لُٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

جب سنا رحم سے یہ ولولہ انگیز خطاب
کہا انصاف نے ہو حکم تو دوں اس کا جواب

آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں
کیونکہ ہے ذکرِ جمیل آپ کا مشہورِ جہاں

مگر اے رحم بُرا ماننے کی بات نہیں
نیکیاں آپ کو کردیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروّت بھی بڑی ہے اک چیز
پر مروّت کے لئے شرط ہے، اے دوست! تمیز

بے مروّت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

راست بازی جو سنی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

معتدل نام ہے جس کا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اس ملک سے جس ملک میں راج اپنا ہے

جو ہنر مند ہے دل ان کے بڑھاتا ہوں میں
خوبیاں ان کی زمانہ میں جتاتا ہوں میں

بے ہنر ہو کسی پیرایہ میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنر مند نہیں بن سکتا

گفتگو ختم پہ انصاف کی جب آ پہنچی
عقل پُر کار قضا کار وہاں جا پہنچی

عقل نے دونوں کی تقریر سنی سرتاپا
کہہ چکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب ان کو دیا

خیر، اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں
ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالبِ بے روح نہ ہوگر انصاف

اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلّف سرِ مو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

مولانا حالؔی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آئے جہاں غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبت سے استفادہ کیا۔ شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ لاہور میں نئی نظم کی تحریک سے وابستہ رہے۔ وہ سرسید تحریک کے سب سے اہم اراکین میں تھے۔ وہ اردو کے اولین نقاد تھے۔ ساتھ ہی مستند سوانح نگار اور صاحب طرز انشاء پرداز بھی تھے۔ مقدمہ شعروشاعری حالؔی کے دیوان کا مقدمہ ہے جسے اردو تنقید کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اصلاحی موضوعات پر بہت سی نظمیں کہیں جن میں ''چپ کی داد''، ''بیوہ کی مناجات'' اور ''مدوجزر اسلام'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

حالی انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ان کی طبیعت پر مغربی خیالات کا بہت اثر ہوا۔ نئے نئے عنوانات اور موضوعات پر نظمیں لکھیں جن میں سادگی و روانی اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ حالی ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تصانیف میں ''حیات جاوید'' ''یادگار غالب'' اور ''مقالات حالی'' کو اردو ادب میں خاص مقام حاصل ہے۔

معنی اور اشارے:

مناظرہ = بحث ومباحثہ

تحیر = حیرت

بیگانے = اجنبی - غیر - پرائے

بیگانے × یگانے

زیاں = نقصان

نمرود = حضرت ابراہیمؑ کے دور کا ظالم بادشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا

فرعون = حضرت یوسفؑ کے دور کا ظالم بادشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا

مسکن = ٹھکانہ

فگار = زخمی - گھائل - مجروح

کام روائی = کام نکلنا

حق = اللہ تعالیٰ

قضا کار = اتفاقاً

الطاف = مہربانی

لطف + الطاف

خلق = مخلوق

عدل = انصاف

ولولہ انگیز = جوش سے بھرا ہوا

ان کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔

''مناظرۂ رحم و انصاف'' حالی کی ایک دلچسپ اور پر تاثیر نظم ہے جو دو ایسی انسانی جبلتوں کے درمیان بحث و مباحثہ کے روپ میں پیش کی گئی ہے جنھیں ہم رحم اور انصاف کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ایک مکالماتی نظم ہے۔ رحم اپنی رحم دلی پر نازاں ہے اور انصاف پر اسکی سخت گیری۔ بے مروتی اور بے گانگی کے سبب چوٹ کرتی ہے۔ مگر انصاف رحم کا ولولہ انگیز خطاب سن کر اپنے اوصاف گنا تا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ راست بازی اور حق گوئی ہی میرا جوہر ہے اور میرا کام ہنرمندوں کو ان کی خوبیوں سے روشناس کرانا اور بے ہنروں کو ان کی بے مائگی کا احساس دلانا ہے۔ رحم و انصاف کے اس مناظرہ کے اختتام پر عقل دونوں کا مناظرہ سن کر انہیں یہ جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ ہمارے معاشرے اور ہماری قوم کے لئے رحم اور انصاف ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ رحم، انصاف کے بغیر ایک قالبِ بے روح ہے اور انصاف، رحم کے بغیر ایک دیدۂ بے نور ہے۔ لہٰذا کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں، دونوں گل و شبنم کی طرح ایک دوسرے کے لئے زیب و زینت کا ساماں فراہم کرتے ہیں دونوں کی اپنی اہمیت ہے دونوں کا اپنا اپنا انداز بھی۔ اس نظم کے ذریعہ حالی ہمیں یہ پیام دنیا چاہتے ہیں کہ معاشرے اور قوم کے اندر امن و امان قائم رکھنے اور ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لئے انصاف اور رحم کا ہونا بہت ضروری ہے۔

نظم حد درجہ سلاست اور روانی کی آئینہ دار ہے۔ انصاف اور رحم سے متعلق جتنے بھی اوصاف ہیں شاعر نے انہیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔ انداز بیان کی دلکشی نظم کی ابتدا سے آخر تک ملحوظ ہے۔ تشبیہ اور استعاروں کے ساتھ شعری صنعتوں کا استعمال بھی اس نظم کی خوبیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ان اشعار پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں صنعت تضاد اور صنعت تلمیح کا استعمال کس خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست
یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

پہلے شعر میں اپنے بیگانے، دوست اور دشمن، فائدہ اور زیاں۔ دوسرے شعر میں جان پہچان اور انجان۔ ہندو اور مسلمان جیسے متضاد الفاظ سے اشعار کو مزین کیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں حضرت ابراھیمؑ اور حضرت یوسفؑ کے دور کے ظالم بادشاہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نمرود نے حضرت ابراھیمؑ کے عہد میں خدائی کا دعویٰ کیا تھا وہ ہلاک ہوگیا۔ اسی

طرح یوسفؑ کے دور میں فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ بھی دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔ آپ بھی اس نظم میں شعری خوبیوں کی نشان دہی کر کے اپنے استاد کو دکھایئے۔

غور وفکر:

1- ذیل کے مصرعوں کو پورا کیجیے:

1) جان اور مال سے ....کو کھایا تو نے

2) ....کروڑوں ہوتے سرتن سے جدا

3) رحم ہے نام مرا ....کام مرا

4) لٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے ....

2- جوڑ لگایئے:

الفاظ		معنی اور اشارے
مناظرہ	-	صبر تحمل
تحیّر	-	حضرت ابراھیمؑ کے دور کا ایک ظالم بادشاہ
نمرود	-	ٹھکانہ
مسکن	-	حیرت
شکیب	-	مباحثہ

3- مصرعوں میں الفاظ کے الٹ پھیر کو درست کیجیے:

(۱) وہ راست بازی جو کی ہو: میری طبیعت ہے
جسے عدالت اور کہتے ہیں: وہ ہے مری عادت

(۲) تم خلق کے دونوں ہو: یہ شکیب و آرام
شبنم و گل کی طرح ایک کو زیب ہے ایک سے

4- اس شعر کی نثر کیجیے:

بے ہنر ہو کسی پیرایہ میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنر مند نہیں بن سکتا

5- مختصر سوالات:

1) ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر کیا پوچھا؟
2) انصاف نے کسے جان و مال سے محروم کیا اور کسے دریا میں ڈبو یا؟
3) رحم کی چند صفات بیان کیجیے۔
4) انصاف نے اپنا زیور کسے قرار دیا؟

6- توضیحی سوالات:

1) رحم نے انصاف کی کن خرابیوں کا ذکر کیا ہے؟
2) انصاف نے اپنی مدافعت میں اپنی کون سی خوبیاں بیان کی ہیں؟

3) رحم اور انصاف میں آپ کس کو پسند کریں گے اور کیوں؟

4) متن کے حوالے سے اشعار کی تشریح کیجئے:

(۱) خیر، اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں
ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں

(۲) میں ہر اک دور میں ہو جاتا ہوں انسان کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

-7 تفصیلی سوالات:

1) اس نظم کا عنوان ''مناظرۂ رحم و انصاف'' کیوں ہے؟

2) ان مصروں میں کون سے واقعات کی طرف اشارہ ہے؟

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

3) اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

اہلِ بیت کی زندگی

مولانا شبلی نعمانیؒ

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکّی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینے پہ مشک بھر کے جو لائی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

اَٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غُبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

آخر گئیں جنابِ رسولِؐ خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اِذن عام تھا

محرم نہ تھے جو لوگ، تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا

پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے
کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا

غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ مُنہ سے کہہ سکیں
حیدرؓ نے اُن کے مُنہ سے کہا جو پیام تھا

ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا

میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں
میں ان کا ذمّے دار ہوں میرا یہ کام تھا

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

خاموش ہو کے سیّدۂ پاک رہ گئیں!
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مُطّہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

شبلی نعمانی

شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام ہندول ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے مشہور عالم مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ تلاش علم کے لئے رام پور، لاہور، سہارنپور اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہے۔ بہترین اساتذہ سے منطق، حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا اور کچھ دن وکالت بھی کی لیکن یہ پیشہ پسند نہ آیا۔ اس کو چھوڑ کر سرکاری ملازمت کر لی اور امین دیوانی ہو گئے۔ یہ ملازمت بھی انہیں راس نہ آئی۔ اسلئے استعفیٰ دیکر علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ گئے۔ وہاں سر سید سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے شبلی کو فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ شبلی کو بھی علمی ذوق کی وجہ سے یہ جگہ پسند آئی اور ساتھ ہی ساتھ اہل علم کی صحبت بھی حسب دل خواہ نصیب ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے اعظم گڑھ چلے آئے۔ مگر سید علی بلگرامی کی کوششوں نے آپ کو حیدر آباد جانے پر مجبور کیا۔ شبلی یہاں چار برس تک بحیثیت ناظم محکمۂ تعلیم کام کرتے رہے۔ انہوں نے سلسلہ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں۔ چنانچہ علم الکلام، الغزالی، موازنۂ انیس و دبیر، سوانح مولانا

روم، یہ سب قیام حیدر آباد کی تصنیف ہیں۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کا قیام بھی آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں آپ انتقال کر گئے۔

آپ کی تحریروں میں صفائی اور سادگی ملتی ہے۔ دلچسپ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی جا بجا کام لیتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین کو سلیس اردو میں ڈھال لیتے ہیں۔ عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو مزہ تقریر سے حاصل ہو سکتا ہے وہ آپ کی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے۔

معنی اور اشارے

اہلِ بیت = حضور ﷺ کے خاندان والے

افلاس = مفلسی۔تنگ دلی۔غریبی

سیدۂ پاک = حضرت فاطمہؓ بنتِ رسول ﷺ

کنیز = خادمہ

مشک = پانی بھرنے کی کھال

نیل فام = نیلے رنگ کا

اِذنِ عام = اجازت جو عام لوگوں کو دی جاتی ہے۔

محرم = قریبی رشتہ دار جس کے ساتھ نکاح جائز نہ ہو

غیرت	=	شرم-حیا
حیدرؓ	=	حضرت علیؓ کا لقب
ہنوز	=	ابھی
مقدم	=	افضل
دختر	=	بیٹی
خیرالانام	=	مخلوق کی بھلائی چاہنا-حضور ﷺ کا لقب

زبان و بیان

مولانا شبلی پیشہ ور شاعر نہیں تھے اس لئے انہوں نے شاعری میں اپنا زورِ قلم نہیں دکھایا۔ ان کی حیثیت ایک مورخ، ایک سوانح نگار اور ایک نقاد کے مسلّم ہے۔ لیکن جو کچھ بھی لکھا وہ اردو شاعری کا قابلِ قدر سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ پیشِ نظر نظم ''اہل بیت کی زندگی'' مولانا شبلی کی دلچسپ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم کے ذریعہ شبلی نے قوم کو غیرت و عبرت حاصل کرنے کا بہترین درس دیا ہے۔ سرورِ کائنات آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں کو اہلِ بیت کہا جاتا ہے۔ ''اہلِ بیت'' اردو شاعری میں ایک اصطلاح بن گئی ہے۔ شبلی نعمانی اہلِ بیت کی زندگی کے چند پہلوؤں کو اس نظم میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہلِ بیت پر اظہارِ خیال کرنا خود بھی ایک کارِ ثواب ہے۔ اس کے لئے عقیدت صداقت اور خلوص چاہئے جو ہمیں شبلی کی اس نظم میں

اوّل تا آخر نظر آتا ہے۔ شبلی کی یہ نظم مکالماتی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ حضورؐ کی دختر نیک اختر حضرت بی بی فاطمہؓ جو پوری اُمت مسلمہ کے لئے قابل صد احترام اور قابل تقلید نمونہ ہیں۔ ان کی خانگی زندگی کے دو ایک پہلو کو مولانا شبلی نے اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔

شہنشاہ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا عالم یہ تھا کہ کام کاج کے لئے نہ تو کوئی کنیز تھی اور نہ کوئی غلام موجود تھا۔ سیدۂ پاک گھر کا پورا کام سرانجام دیتی تھیں۔ دن رات چکّی کے پیستے رہنے سے حضرت بی بی فاطمہؓ کی دونوں ہتھیلیاں گھس گئی تھیں۔ بار بار مشک بھر کے پانی لانے کے سبب چہرۂ انور نیل فام اور لباس مبارک غبار آلود ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود آپ کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ آخر کار جنابِ رسالت مآب سے رجوع کرنے کا ارادہ کرتی ہیں لیکن حضورؐ کے پاس غیر محرموں کو دیکھ کر واپس تشریف لے آتی ہیں۔ پھر دوبارہ جب جناب رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں تو حضورؐ اپنے لختِ جگر حضرت بی بی فاطمہؓ سے آنے کی وجہ دریافت فرماتے ہیں غیرت کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہؓ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتیں۔ البتہ حضرت علیؓ نے جو بھی پیام تھا وہ حضور کو سنایا۔ یہ پیام سن کر حضورؐ یہ جواب عرض کرتے ہیں کہ میرے نزدیک وہ غریبان بے وطن زیادہ مقدم ہیں جن کا بھوک پیاس سے سونا

حرام ہوگیا ہے۔ حضورؐ کے اس جواب سے سیدۂ پاک خاموش رہ گئیں اور گھر لوٹ آئیں۔ اس نظم کے ذریعہ شبلی دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آرام و آسائش آدمی کا مقدر نہیں ہے اور نہ اس دنیا کا دستور ہے۔ دنیا تو دارالعمل ہے یہاں، محنت و مزاولت، جدو جہد اور کوشش و جستجو زیادہ کرنی پڑتی ہے اور آرام کم نصیب ہوتا ہے۔ اسلئے اہل بیت کی زندگی سے شبلی یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ جب راحت اور چین اہلِ بیت کو نصیب نہ ہوسکا تو پھر ہم ان کے امتی ہوتے ہوئے آرام و آسائش کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟ آرام طلب، عیش و عشرت میں زندگی گذارنے والوں کے لئے یہ نظم نہ صرف تازیانۂ عبرت ہے بلکہ سبق آموز بھی۔

نظم مترنم اور رواں بحر میں لکھی گئی ہے۔ نظم کے ہر ہر لفظ سے عقیدت اور خلوص ٹپکا پڑتا ہے جو اس نظم کا تقاضا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور اہلِ بیت کا پاس و لحاظ ہر شعر میں نمایاں ہے۔ نظم میں کل چودہ شعر ہیں ابتدا سے آخر تک شبلی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اہلِ بیت کی زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم میں ہمواریٔ کلام کے ساتھ ساتھ روانی اور سلاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اسلئے اسے فکری اور فنی اعتبار سے شبلی کی کامیاب نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

غور وفکر

1- جوڑ لگائیے:

	الف (واحد)		ب (جمع)
1)	نور	-	دختراں
2)	حال	-	مقامات
3)	اتفاق	-	پیامات
4)	پیام	-	غریباں
5)	ارشاد	-	حالات
6)	غریب	-	ارشادات
7)	مقام	-	اتفاقات
8)	دختر	-	انوار

2- ذیل میں دیے گئے مناسب قوافی سے اشعار مکمل کیجیے:

[پیام - قیام - حرام]

1) غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ مُنہ سے کہہ سکیں
حیدرؓ نے اُن کے مُنہ سے کہا جو .... تھا

2) کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا .... تھا

3) ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبویؐ میں .... تھا

3- ذیل کے مصرعوں سے دو مکمل شعر نکالیے:

1) یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
2) افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
3) جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا
4) آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس
5) خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں

4- مختصر سوالات:

1) اہل بیت سے کیا مراد ہے؟
2) افلاس سے حضرت بی بی فاطمہؓ کا کیا حال تھا؟
3) ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں کیوں گھس گئی تھیں؟
4) حضرت فاطمہؓ رسول خدا کے پاس کیوں گئی تھیں؟
5) بی بی فاطمہؓ نے اپنے آنے کا سبب کیوں نہیں بتایا؟
6) حضرت علیؓ نے ان کی طرف سے کیا کہا؟

5- توضیحی سولات:

1) مندرجہ ذیل اشعار کی بحوالہ متن تشریح کیجیے۔

(۱) کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

(۲) اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

(۳) آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا

6- تفصیلی سوالات

1) اہل بیت نے اپنی زندگی کس طرح گذاری؟
2) دربار رسالت سے حضرت فاطمہؓ کو کیا جواب ملا؟
3) اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
4) شبلی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

ساقی نامہ

علامہ اقبال

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مِری خاک جگنو بنا کر اُڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ ترکی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

اُمنگیں مِری آرزوئیں مِری
اُمیدیں مِری جستجوئیں مِری

مِری فطرت، آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغ زار

مرا دل، مری رزم گاہِ حیات　　گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند　　سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے　　تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ہوا جب اسے سامنا موت کا　　کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں　　رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج　　اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے　　اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات　　ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس　　ازل سے ابد تک رم یک نفس

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن سے فارسی، عربی اور دیگر مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ ہی میں ایک انگریزی اسکول سے امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسکاچ مشن اسکول سے ایف - اے کیا۔ لاہور میں اعلا تعلیم حاصل کی اور بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شاعری کی طرف بچپن سے مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں داغؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ابتدا میں اقبالؔ نے خط و کتابت کے ذریعے ان سے اصلاح لی۔ لاہور ہی میں اعلیٰ تعلیم کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ جب پروفیسر آرنلڈ انگلینڈ چلے گئے تو انھیں کے اصرار پر اقبالؔ نے 1905ء میں یوروپ کا سفر کیا۔ وہاں فلسفے میں مزید مہارت حاصل کی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد جرمنی چلے گئے جہاں میونخ یونیورسٹی سے ایران میں فلسفے کے ارتقاء پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن واپس آکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1908ء میں ہندوستان واپس آئے اور سررشتۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد بیرسٹری شروع کردی۔ اقبالؔ کی عالم گیر مقبولیت اور علمی مرتبے سے متاثر ہوکر حکومتِ برطانیہ نے انھیں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ

انھیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ علامہ اقبالؔ نے ایک طویل علالت کے بعد لاہور میں انتقال کیا۔

علامہ اقبالؔ کی نگارشات میں انگریزی نثر، خطوط، فارسی اور اردو شاعری شامل ہیں۔ اردو میں ان کی شاعری کا سرمایہ ''بانگِ درا''، بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' پر مشتمل ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' ان کے اردو اور فارسی کلام کا مشترک مجموعہ ہے۔ فارسی نظم میں اقبالؔ کی کئی کتابیں ہیں۔

اقبالؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ لیکن جلد ہی نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے زبان کو جس فنکارانہ انداز سے برتا، اس سے اردو شاعری میں نئے خیالات کے اظہار کی مختلف راہیں کھلیں، نئی تشبیہات، استعارات اور تراکیب نے جگہ پائی اور اس طرح اردو میں نئے تخلیقی امکانات پیدا ہوئے۔

اقبالؔ نے اپنی شاعری کو اپنے خاص پیام کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کی فکر میں حرکت و عمل کا فلسفہ کارفرما ہے، جس کو انھوں نے فلسفۂ خودی کے نام سے پیش کیا۔ اقبالؔ کو قومی و مذہبی مسائل سے خاص دل چسپی رہی ہے۔ مادّیت اور مغربیت کی غلامی سے آزادی کے خیالات بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ اقبالؔ

بلند ہمتی ، خودداری ، سربلندی اور قلب ونظر کی وسعت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان اوصاف کو انسانیت کی بقا کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔

زبان وبیان

ماہرین ادب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ فکری وفنی اعتبار سے ''ساقی نامہ'' اقبالؔ کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ اقبالؔ کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ لیکن اس نظم کے صرف دو بند نصاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے بند میں شاعر نے نوجوانانِ ملت کے حق میں ساقی (اللہ) سے دعائیں کی ہیں جبکہ دوسرے بند میں زندگی کی خصوصیات واضح کی ہیں۔

پہلے بند میں اقبالؔ نے اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ مجھ کو اپنے محبوب (صلے اللہ علیہ وسلم) کی محبت عطا فرما تا کہ میرے اندر بھی صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کا رنگ پیدا ہو سکے اپنے حق میں دعا کرنے کے بعد انہوں نے ملت کے نوجوانوں کے لئے بھی دعا مانگی ہے کہ میرے کلام کے ذریعہ سے ان کے اندر بھی عشق رسول کا جذبہ پیدا کر دے۔

اس کے بعد اقبال قوم کی لئے دعا کرتے ہیں کہ میری قوم کی کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے اس کو صحیح وسلامت ساحل مقصود تک پہنچا دے۔ نیز میری قوم عمل سے بیگانہ ہوگئی ہے اس کے اندر حرکت وعمل پیدا کر دے۔

اے خدا ۔ری قوم کے افراد میں عشق و محبت کا وہی رنگ پیدا کر دے جو میرے اندر موجود ہے۔ وہی بے خوابیاں، وہی اختر شماریاں، وہی بے تابیاں، وہی آہ وزاریاں، وہی طرز نیاز، وہی کیفیت سوز و گداز، وہی آرزوئیں، وہی جستجوئیں، وہی خیالات اور وہی افکار عطا کر دے۔

دوسرے بند میں زندگی کی صفات واضح کی گئی ہیں اقبال کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی شئے ساکن یا جامد نہیں ہے۔ ہر شئے میں حرکت ہے خواہ محسوس ہو یا نہ ہو۔ وجود ہر آن نئی نئی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور ہر لحظہ نئی صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

جو لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں وہ زندگی کو ایک راز سمجھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے راز ہی ہے لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ زندگی ذوق پرواز کا دوسرا نام ہے یعنی زندگی کی غایت یہ ہے کہ وہ ہر وقت ارتقائی منازل طے کرتی رہے۔

اقبال زندگی کی خاصیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ تصادم ہنگامہ اور آویزش میں لذت محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کا ارتقاء انہی باتوں پر موقوف ہے۔

اقبال کی اس نظم میں غیر معمولی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے پوری نظم محاسن شعری کی حامل ہے اور خلوص اور سوز جگر کی آئینہ دار بھی۔

غور و فکر:

1- ذیل کے اشعار پڑھیے اور نیچے دیے ہوئے سوالات کے مختصر جواب لکھیے:

(الف) تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے

1) ''دل مرتضیٰ اور سوز صدیق'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(ب) فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

2) ''سکون و ثبات'' کو اقبال فریب نظر کیوں قرار دیتے ہیں؟

2- ذیل کے شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجیے:

سوز جگر جوانوں کو بخش دے
میری نظر مرا عشق بخش دے

3- دیے گئے الفاظ/حروف سے اشعار مکمل کیجیے:

[لشکر - آئینہ - حیات - افکار]

1) مری فطرت .... روزگار
غزالان .... کا مرغ زار

2) مرا دل مری رزم گاہ ....

گمانوں کا ....یقیں کا ثبات

4- جوڑ لگا کر مصرعے مکمل کیجیے:

1)	خرد کو غلامی سے	-	زوج زوج
2)	تا مجھ کو اسرار	-	حضر ہے مجاز
3)	اسی سے فقیری میں	-	آزاد کر
4)	سفر ہے حقیقت	-	ہوں میں امیر
5)	مذاق دوئی سے بنی	-	مرگ و حیات

5- مختصر سوالات:

1) اقبالؔ کے اردو مجموعہ کلام کون کون سے ہیں؟

2) اقبالؔ کی تاریخ ولادت اور وفات لکھئے؟

3) ''شراب کہن'' اور ''جام'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

4) اقبالؔ قوم کے افراد میں کسطرح کا عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔

5) کاروانِ وجود کیوں نہیں ٹھہرتا؟

6- توضیحی سوالات:

1) اس شعر کی تشریح کیجیے:

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

2) نوجوانوں سے متعلق اقبال کیا دعا کرتے ہیں؟
3) پہلے بند کا ماحصل بیان کیجئے؟

7- تفصیلی سوالات
1) نظم ''ساقی نامہ'' کا مرکزی خیال واضح کیجئے؟
2) دوسرے بند کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے؟
3) اقبالؔ کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کیجئے؟

خدا کی نعمتیں

جوشؔ ملیح آبادی

(۱)

پینے کو میسّر پانی ہے، کھانے کے لئے حاضر ہے غذا
تفریح کو سبزہ جنگل کا، صحّت کی محافظ صاف ہَوا
پوشش کے لئے ملبُوس بھی ہے، رہنے کو مکاں بھی سُتھرا سا
اور اس کے سوا کیا حاجت ہے، انصاف تو کرتُو دل میں ذرا
راحت کے لئے جو سامان ہیں، قدرت نے بہم پہنچائے ہیں
اے بندۂ زر! پھر تیری ہوس نے پاؤں یہ کیوں پھیلائے ہیں

(۲)

دولت کا نتیجہ کلفت ہے، سامانِ اِمارت ذِلّت ہے
جِس دل میں ہوس کی کثرت ہے، دُور اس سے حقیقی راحت ہے
ارمان بہت ہیں، کم کردے ہستی یہ نہیں، اِک غفلت ہے
آغاز سراپا دھوکا ہے، انجام سراسر عبرت ہے

تاریخ اُٹھا بتلائیگی وُہ، دُنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دِل پہ ہوس کا سکّہ ہے، اس دل کے لئے آرام نہیں

(۳)

صحّت میں تِری کچھ ہرج نہیں، اعضاء میں ترے نقصان نہیں
پھر بھی یہ شکایت تجھ کو ہے، اسباب نہیں سامان نہیں
انعامِ خُدا کا مُنکر ہے، اللہ پہ اِطمینان نہیں
تو حرص و ہوا کا بندہ ہے، مضبُوط تِرا ایمان نہیں
دُنیا کی حکومت تیری ہے، اپنے کو گدا کیوں کہتا ہے
سامانِ فراغت حاضر ہیں، بیکار پریشان رہتا ہے

(۴)

یہ ابر، یہ وادی، یہ گُلشن، یہ کوہ و بیاباں، یہ صحرا
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ سبزہ، یہ موسمِ گُل، یہ سرد ہَوا
یہ شام کی دلکش تفریحیں، یہ رات کا کا گہرا سناٹا
یہ پچھلے پہر کی رنگینی، یہ نورِ سحر، یہ موجِ صبا

معبُود کی کِس کِس بخشش کو، مُکرے گا چھپائے جائیگا
اللہ کی کس کس نعمت کو، اے مُنکرِ دیں جھٹلائیگا

(۵)

اللہ کی رحمت عام ہے سب پر ''شاہ'' ہو اس میں یا ہو ''گدا''
یہ چاند، یہ سُورج، یہ تارے، یہ نغمۂ بُلبُل، یہ دریا
دونوں کے لئے یہ تحفے ہیں، کچھ فرق اگر ہے تو اتنا
اِن جلووں سے لذّت پاتا ہے، آزاد کا دِل منعم سے سوا
شاہوں کے سروں میں تاجِ گراں سے درد سا اکثر رہتا ہے
جو اہلِ صفا ہیں اُن کے دل میں نُور کا چشمہ بہتا ہے

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے لکھنو، سیتاپور، آگرہ اور علی گڑھ کے اسکولوں میں سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں وہ حیدرآباد گئے۔ یہاں وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں ناظر ادب کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ 1934ء میں حیدرآباد چھوڑ کر دہلی آگئے۔ یہاں انھوں نے اپنے کئی

شعری مجموعے شائع کئے اور ایک رسالہ ''کلیم'' بھی جاری کیا آزادی کے بعد وہ حکومت ہند کے رسالہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر ہو گئے حکومت ہند نے انھیں ''پدم بھوشن'' کا اعزاز عطا کیا۔ 1956ء میں وہ پاکستان چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔

اُن کے کم و بیش ایک درجن مجموعے منظر عام پر آئے ان میں کچھ کے نام ہیں۔ ''نقش و نگار'' ''شعلہ و شبنم'' ''حرف و حکایت'' جنون و حکمت'' ''آیات و نغمات'' اور ''سنبل و سلاسل'' ان کی خود نوشت سوانح ''یادوں کی برات'' کو بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔

جوش نے غزلیں بھی کہیں اور رباعیاں بھی لکھیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ابتدائی نظموں میں وہ ایک جذباتی، رنگین مزاج اور حسن پرست نوجوان نظر آتے ہیں تحریک آزادی کی فضا میں حب وطن اور سیاسی مسائل ان کی نظموں کا موضوع بننے لگے۔ ان موضوعات پر انھوں نے بڑی پُر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں اور شاعر انقلاب کہے جانے لگے۔ ان کی بعض نظمیں باغیانہ خیالات کی وجہ سے برطانوی حکوست نے ضبط کر لیں۔

معنی اور اشارے

محافظ = حفاظت کرنے والا

پوشش	=	لباس - پوشاک
ملبوس	=	پہننے کے کپڑے
حاجت	=	ضرورت
بہم پہنچانا	=	دینا - عطا ہونا
بندۂ زر	=	دولت کا بندہ
ہوس	=	حرص
کلفت	=	رنج - تکلیف
سامانِ امارت	=	حکومت کے سامان
سراپا	=	سر سے لیکر پیر تک
اعضا	=	عضو کی جمع
عضو	=	جسم کا حصّہ
منکر	=	انکار کرنا
گدا	=	فقیر
معبود	=	جس کی عبادت کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ)
مکرنا	=	قول سے پھرنا
منعم	=	نعمت دینے والا - مالدار
تاج گران	=	بھاری تاج
اہل صفا	=	متقی اور پارسا لوگ

زبان و بیان

جوش کو ''شاعر انقلاب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نظم میں جوش کا رنگ و آہنگ طنزیہ اور اصلاحی نظر آتا ہے۔ جوش نے خدا کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ کل پانچ بندوں میں کیا ہے۔ پہلے بند میں آدمی کی بنیادی ضرورتوں کے لئے خدا کی جو نعمتیں میسر ہیں ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی، ہوا، کھانا، کپڑا اور مکان آدمی کی روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرنے اور زندہ رہنے کے لئے کافی ہیں۔ اس کے باوجود جوش کہتے ہیں کے دولت کا بندہ اپنی حرص و ہوس کے سبب پاؤں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرے بند میں جوشؔ نے حرص و ہوس کی بدولت حاصل ہونے والی دولت اور سامان امارت سے برآمد ہونے والے نتائج کو بھی ظاہر کردیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ دولت سے رنج اور تکلیف بڑھتی ہے اور سامان امارت باعث ذلت ہوتے ہیں۔ دلوں میں ہوس کی کثرت سے زندگی کی راحتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اسلئے جوشؔ آرزو اور ارمان کم کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ یہ سب چیزیں آدمی کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہیں۔

تیسرے بند میں شاعر نے انسان کی بے وجہ پریشانیوں اور شکایتوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ انسان خدا کی تمام نعمتوں سے سرفرازی کے باوجود وہ اپنی حالت زار اور بے اطمینانی کی شکایت کرتا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ

ہونا چاہئے کہ دنیاداری اور ہوس پرستی کے سبب اس کا ایمان کمزور ہو گیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ انعامِ خدا کا منکر ہو گیا ہے۔

چوتھا بند سورۃ رحمٰن کی اُس آیت کا ترجمان معلوم ہوتا ہے جو پوری سورۃ میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس بند میں اللہ کی اُن نشانیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو انسان کی ذات سے باہر نظر آتی ہیں۔ جن سے انسان رات دن لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ کوہ و بیاباں، وادی و گلشن، رات اور دن، نورِ سحر اور موجِ صبا یہ سب کچھ اللہ ہی کی بخششیں اور نعمتیں ہیں جن کی حقیقت سے حضرت انساں روگردانی کر رہا ہے۔

آخری بند میں لطیف طنزیہ انداز بھی ہے اور اہلِ صفا اور بادشاہوں کے درمیان تقابل بھی کیا گیا ہے۔ شاعر ایک طرف اہلِ صفا کی پاک دامانی کو ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کے دلوں سے نور کے چشمے بہتے ہیں لیکن بادشاہوں کے پاس اگرچہ دولت اور حکومت ہے ہر طرح کے اسباب فراغت موجود ہیں۔ سروں پر قیمتی تاج ہیں لیکن وہ اکثر پریشانی اور بے اطمینانی کا شکار رہتے ہیں۔

اس نظم میں خدا کی ساری نعمتوں کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بندوں کی نافرمانی اور ناشکری پر اظہار طنز بھی ہے۔ مترنم رواں بحر اور سیدھے سادے الفاظ میں انداز بیان کا وہ

جادو جگایا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مترادف الفاظ کا فن کارانہ استعمال ملاحظہ ہو:

یہ ابر، یہ وادی، یہ گُلشن، یہ کوہ و بیاباں، یہ صحرا
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ سبزہ، یہ موسمِ گُل، یہ سرد ہَوا

اسی طرح متضاد الفاظ وتراکیب کا کمال دیکھئے:

دولت کا نتیجہ کلفت ہے، سامانِ اِمارت ذِلّت ہے
جس دل میں ہوس کی کثرت ہے، دُور اس سے حقیقی راحت ہے

اللہ کی رحمت عام ہے سب پر "شاہ" ہو اس میں یا ہو "گدا"
یہ چاند، یہ سُورج، یہ تارے، یہ نغمۂ بُلبُل، یہ دریا

غور و فکر:

1- ذیل میں دیے گئے مناسب قوافی سے اشعار مکمل کیجیے:

[جھٹلائے - ذلّت - سامان]

1) دولت کا نتیجہ کلفت ہے، سامانِ اِمارت .... ہے
جس دل میں ہوس کی کثرت ہے، دُور اس سے حقیقی راحت ہے

2) صحت میں تری کچھ ہرج نہیں، اعضاء میں ترے نقصان نہیں
پھر بھی یہ شکایت تجھ کو ہے، اسباب نہیں .... نہیں

3) معبود کی کس کس بخشش کو، مکرے گا چھپائے جائیگا
اللہ کی کس کس نعمت کو، اے منکرِ دیں ....گا

2- جوڑ لگایئے:

	الفاظ	معنی اور اشارے
1)	پوشش	مالدار-نعمت دینے والا
2)	کلفت	قول سے پھرنا
3)	سراپا	لباس-پوشاک
4)	مکرنا	سر سے پیر تک
5)	منعم	رنج-تکلیف

3- ذیل کے الفاظ کے قافیے بنایئے:
[کلفت-مکان-انعام-ایمان-گدا]

4- مختصر سوالات:
1) خدا کی ان نعمتوں کا تذکرہ کیجئے جو انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں؟
2) شاعر انسان سے ''انصاف تو کر تو دل میں ذرا'' کیوں کہتا ہے؟
3) کلفت اور ذلت کا سبب کیا ہے؟

4) بندہ زر کسے کہتے ہیں؟

5) شاعر کے نزدیک ہوس و حرص کا کیا نتیجہ ہے؟

5- توضیحی سوالات

1) ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجئے:

۱) ارمان بہت ہیں، کم کردے ہستی یہ نہیں، اِک غفلت ہے
آغاز سراپا دھوکا ہے، انجام سراسر عبرت ہے

۲) شاہوں کے سروں میں تاجِ گراں سے دردسا اکثر رہتا ہے
جو اہلِ صفا ہیں اُن کے دل میں نُور کا چشمہ بہتا ہے

2) دوسرے بند کا مطلب بیان کیجئے۔

3) قدرت نے ہماری راحت کے لئے کیا سامان بنائے ہیں؟

6- تفصیلی سوالات

1) شاعر نے خدا کی جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیجئے؟

2) اس نظم کی شعری خوبیوں پر روشنی ڈالئے؟

3) جوش کی شاعری کے بارے میں اپنی معلومات سپرد قلم کیجئے؟

خاکِ وطن

جاں نثار اختر

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے ہر اک گاؤں سے
ہمیں پیار اپنی عمارت سے
سلامت رہیں اپنے دشت و دمن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں
چمکتا دمکتا رہے شیش ناگ
رہے پاک گنگوتری کی پھبن
رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ
لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ
رہیں سُرخرو سیکری کے محل
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
اجنتا کے بُت رقص کرتے رہیں

محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
ہمیں پیار اپنی روایات سے
رہے گنگناتا ہمارا گگن
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
رہے وادیوں میں چناروں کی آگ
مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن
چمکتی خنک چاندنی، نرم دھوپ
یہ گوکل کی گلیاں یہ کاشی کی گھاٹ
یہ صبحِ بنارس، یا شامِ اودھ
یہ نینی کی جھیلوں میں کھلتے کنول
رہے تا قیامت محبت کی لاج
حسیں غار تاروں سے بھرتے رہیں

رہیں مُسکراتی حسیں وادیاں
ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
مہکتے رہیں سبز آموں کے بور
سلامت یہ متھرا کی نگری رہے
رہیں ہولیوں کے سدا ہاتھ لال
رہے یہ دیوالی کی جگ مگ بہار
فضا روشنی میں نہاتی رہے
رہے آسماں پر دمکتا ہلال
گلا سے گلے لوگ ملتے رہیں
رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
حسیں راکھیاں جَھل جَھلاتی رہیں
رہے اپنے بھائی پہ بہنوں کو ناز
گھروں کا تقدس رہے برقرار
سلامت رہے دُلہنوں کی پھبن
سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہیں ہیر رانجھے کے گیت

رہیں شاد جنگل کی شہزادیاں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں
زمینوں پہ بجھتے رہیں آسمان
بڑھاتی رہے پینگ جھولے کی ڈور
چھلکتی یہ رنگوں کی گگری رہے
فضاؤں میں اُڑاتا رہے یہ گلال
مُنڈیروں پر جلتے دِیوں کی قطار
ہماری زمیں جگمگاتی رہے
رہے عید کا مُسکراتا جمال
دلوں کے جواں پھول کھلتے رہیں
رہیں شاد یہ گیت گاتے ہجوم
جھماجھم ستارے لُٹاتی رہیں
یہ معصوم نرمی، یہ میٹھا گداز
یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار
سلامت رہیں دل میں کِھلتے چمن
سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا
رہے ہار میں بھی محبت کی جیت

لجاتا رہے مسکراتا رہے
مناتا رہے روٹھ جاتا رہے
محبت کے چشمے اُبلتے رہیں
جواں سال نغموں مین ڈھلتے رہیں
رہے دھوم ٹیگور و اقبالؔ کی
رہے شان پنجابؔ و بنگالؔ کی
رہے نام اپنے ادب کا بلند
دلوں میں سمایا رہے پریمؔ چند
سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالبؔ کا دیواں رہے

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر شخصیت اور شاعری کے اعتبار سے ہر پہلو سے اردو شاعری کے اُس دور کے ممتاز فرد ہیں جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا تھا۔ اختر صاحب پرانے اور نئے ہر دور کے لوگوں میں محترم رہے۔ اور اچھی خاصی عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کا فن بھی واقعی ایسا ہے جیسے وہ اپنی کم بے نیازانہ طبیعت سے جواب ممکن نہیں اور زیادہ باوقار اور عظیم بنا سکتے تھے۔ ان کی طبیعت اور ان کے مزاج میں بہت زیادہ بے نیازی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ کسی چیز سے اتنے سنجیدہ نہیں جتنا سنجیدہ انہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ رویہ ان کا زندگی سے بھی ہے اور شاعری سے بھی۔

جاں نثار اختر بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی

برنائیاں ملتی ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں جس طرح کوئی نباض موسیقی متعدد راگنیوں کو ملا کر ایک ایسا نغمہ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری کا لہجہ کبھی بلند آہنگ اور گھن گھرج والا نہیں رہا۔ اُسے چیختے ہوئے رنگ پسند نہیں۔ اسکی شاعری دھیمی آنچ پر پکتی ہے اور اسکی تشبیہوں، علامتوں اور استعاروں سے آنگن میں کھڑے پیڑوں کو جھولتی شاخوں کی صدا آتی ہے۔ اختر نے اردو شاعری کو ایک نیا تجربہ، ایک الگ موضوع اور ایک نیا تصور عطا کیا ہے جو بیک وقت قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔

معنی اور اشارے

خاک وطن	=	وطن کی مٹی
برگد	=	بڑ کا درخت
عمارت	+	عمارات
دشت	=	جنگل۔صحرا
دمن	=	پہاڑی
گگن	=	آسماں

شیش ناگ	=	ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ایک بڑا سانپ جس کے ہزار سر ہیں اور جو دنیا کو اٹھائے ہوئے ہے۔
چنار	=	ایک خوبصورت درخت جو پھل نہیں دیتا
خنک چاندنی	=	بھیگی ہوئی چاندنی
مدھ	=	شہد
سرخ رو	=	کامیاب
لاج	=	عزت
رقص	=	ناچ
شاد	=	خوش
پینگ	=	جھولے کا لمبا جھونک لینا
ہولی	=	ہندوؤں کا ایک تہوار
گلال	=	لال رنگ
ہلال	=	باریک چاند
راکھی	=	ایک بندھن ہے جسمیں بہن اپنے بھائی کی کلائی میں ڈور باندھتی ہے۔
تقدس	=	پاک
پھبن	=	سجاوٹ - آرائش
گھونگھٹ	=	نقاب

انکھڑی	=	آنکھ + انکھڑیاں
لجاتا	=	شرماتا
سدا	=	ہمیشہ
غزل خواں	=	غزل پڑھنا

زبان وبیان:

اردو میں حبُّ الوطنی پر لکھی گئی چند اہم نظموں میں جاں نثار اختر کی نظم ''خاک وطن'' کا شمار ہوتا ہے۔ اس نظم کے اشعار کی ترتیب دیکھئے۔ ہر شعر کا اپنا قافیہ ہے۔ ایسی نظم کو مثنوی کہتے ہیں۔ نظم کے ہر شعر سے روانی، سلاست اور وارفتگی ٹپکی پڑتی ہے۔ شاعر کو اپنے وطن کی ہر شئے سے محبت ہے۔ اپنے وطن کی سرزمین سے وابستہ تمام چیزیں اسے عزیز ہیں۔ اپنی عمارتیں، اپنی تہذیب، اپنی روایات، اپنے دشت و دمن اپنے پیڑ پودے سبھی اس کے جذبۂ حب الوطنی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک محبّ وطن کی حیثیت سے اُسے اپنے وطن کی ہر تہذیب اور ہر مذہب عزیز ہے۔

اسلئے وہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد، مقامات اور روایات کی پاسداری پورے شد و مد کے ساتھ کرتا نظر آتا ہے۔ اس نظم میں گنگوتری، گنگ و جمن، اشوکا کی لاٹ، شیش ناگ، متھرا کی نگری، گوکل کی گلیاں اور کاشی کے گھاٹ کا تذکرہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

صبح بنارس، شام اودھ، تاج محل اور اجنتا کے غار اور بتوں کے رقص سے بھی شاعر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب اور انداز بیان اتنا بے تکلف اور دلکش ہے کہ اشعار کی قرأت سے ترنم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر اپنے وطن کے تہواروں کا ذکر بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کا پیغام بھی دیتا نظر آتا ہے۔ عید، دیوالی، بسنت، راکھی بندھن جیسے تہواروں کے تذکرے سے شاعر کی حب الوطنی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

شاعر اپنے وطن کے بھائی بہنوں اور ماں بیٹیوں کے لئے سلامتی کی دعا کرتا ہے اور انہیں آپسی پیار و محبت میں سرشار دیکھنا چاہتا ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر اپنے وطن کے نام نہاد شاعر و ادیب ٹیگور، اقبال، غالب اور پریم چند کی یاد تازہ کرتے ہوئے ان کے نام کو روشن رکھنے اور ادب کو پروان چڑھانے کی تلقین کرتا ہے۔

غور فکر

1- ذیل میں دیے گئے مناسب قوافی سے اشعار کو مکمل کیجیے:

[گگن- وادیاں- چمن]

1) محبت ہے خاک وطن سے ہمیں + محبت ہے اپنے .... سے ہمیں

2) سلامت رہیں اپنے دشت و دمن + رہے گنگناتا ہمارا ....

3) رہیں مسکراتی حسین .... + رہیں شاد جنگلی کی شہزادیاں

2- ذیل کے اشعار سے متضاد الفاظ الگ کیجیے:

1) سلامت رہیں ہیرا نجھے کے گیت + رہے ہار میں بھی محبت کی جیت

2) لجانا رہے مسکرانا رہے + منانا رہے روٹھ جانا رہے

3) لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ + یہ صبح بنارس یہ شام اودھ

3- ذیل کے اشعار کو پڑھیے اور دیے گئے سوالات کے جواب لکھیے:

ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار

نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں

گھروں کا تقدس رہے برقرار
یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار

سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا

1- شاعر کو کن کن سے پیار ہے؟

2- شاعر کو ہمالہ کی نگاہوں سے کیا توقع ہے؟

3- تقدس کہاں برقرار رہنا چاہئے اور کن کے ماتھوں پر ماؤں کا پیار ہونا چاہئے؟

4- شاعر کس کی سلامتی چاہتا ہے؟

4- جوڑ لگایئے

	الفاظ		معنی اور اشارے
(1	برگد	-	آنکھ
(2	دشت و دمن	-	کامیاب
(3	گگن	-	ناچ
(4	سرخ رو	-	آسمان
(5	رقص	-	جنگل اور پہاڑی
(6	انکھڑی	-	بڑ کا درخت

5- مختصر سوالات:

(1 وطن کی کن چیزوں سے شاعر محبت کا اظہار کرتا ہے۔

(2 شاعر نے کن کن تہواروں کا تذکرہ کیا ہے۔

(3 شاعر کن چیزوں کی سلامتی کے لئے دعا کرتا ہے۔

(4 اُن ریاستوں، شاعروں اور ادیبوں کے نام لکھئے جو اس نظم میں شامل ہیں۔

6- وضاحتی سوالات:

1) فطرت کے کن مناظر سے شاعر متاثر ہے؟

2) کن کن تاریخی اور مقدس مقامات کا تذکرہ اس نظم میں کیا گیا ہے اور کیوں؟

3) وادیوں، کھیتیوں اور سبز میدانوں کو شاعر کس طرح دیکھنا چاہتا ہے۔

7- تفصیلی سوالات:

1) نظم ''خاک وطن'' کا مرکزی خیال واضح کیجئے۔

2) جاں نثار اختر کی زبان و بیان کی خوبیوں پر اظہار خیال کیجئے۔

مسافر

(دانش فرازی کی یاد میں)

عزیز تمنائی

وہ اچانک چل دیا گویا سفر تھا مختصر
زندگی بھر جو سفر کرتا رہا، چلتا رہا
چھاؤں میں افلاک کی پلتا رہا، ڈھلتا رہا
پاس جو پونجی اجالوں کی تھی سب کچھ بانٹ کر

راہ کے بے مایہ ذرّوں کو بنا کر آفتاب
خود سے لا پروا، زمانے کی نظر سے بے نیاز
زہد سے فطری لگاؤ، دل میں توقیرِ حجاز
جانے کیوں اس کو پسند آئی تھی رندی کی نقاب

مرحلے تاریک تھے اور منزلیں تاریک تر
اس کی ننھی روشنی پیہم رہی ظلمت شکن
صرصرِ بے اعتدالی سے گریزاں فکر و فن
ہوش میں تھا تا دمِ آخر ضمیرِ معتبر

وہ مسافر تھا عدم کی راہ میں گم ہو گیا
غم تو اس کا ہے کہ اک اچھا سا انساں کھو گیا

عزیز تمنائی

ڈاکٹر عزیز الرحمن ضلع شمالی آرکاٹ کے موضع گڈیاتم کے قریب واقع قصبہ ولاتھور میں ـــــــ ءکو پیدا ہوئے۔ آپ کا قلمی نام عزیز تمنائی ہے۔ بہت کم عمری ہی میں شعروشاعری کی دیوی سے دل لگا لیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی انہیں شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پہلے مشاعروں کے لئے غزلیں لکھتے اور پڑھتے رہے۔ پھر ادبیات اور تنقیدی ادب کے مطالعے نے نظم گوئی کی طرف متوجہ کیا اور اقبال کا جادو کام کرنے لگا۔ انگریزی اور یوروپی ادب کے مطالعہ سے جدید شاعری کے بعض اسرار منکشف ہوئے اور ن-م-راشد و میراجی اور ان کے ہم عصروں کی آواز دل کو کھینچنے لگی۔ اسطرح سانیٹ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اگرچہ اختر شیرانی، ن-م-راشد، میراجی اور بعض دوسرے نوجوان شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی تھی لیکن اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مدراس کا ماحول اس کے لئے اور بھی اجنبی تھا اس لئے عزیز تمنائی نے بھی سانیٹ لکھنا ترک کردیا تاہم چونکہ انہیں خاص طرح کی داخلی کیفیات کے اظہار کے لئے یہ صنف موزوں نظر آئی تھی اس

لئے وہ پھر اس کی طرف رجوع ہوئے اور پر شور تخلیقی لگن کے تحت پھر اسی میں اظہار خیال کرنے لگے ان کے سانیٹوں کا پہلا مجموعہ ''برگ نوخیز'' ہے جو اردو میں بھی سانیٹوں کا پہلا مجموعہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''سرہانے کا چراغ'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

سانیٹ غنائی و داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے پہلے آٹھ مصرعوں میں خیال کا پھیلاؤ اور بعد کے چھ مصرعوں میں اسکی تکمیل ہوتی ہے۔ سانیٹ میں قافیہ بندی کا التزام بھی ہوتا ہے لیکن قافیوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ اردو زبان میں سانیٹ ایک پل ہے جو غزل اور نظم کی درمیانی خلیج کو پاٹتا ہے۔ اسمیں غزل کی اشاریت، اس کا رچاؤ اس کی گہرائی، اسکی پنہائی بھی موجود ہے اور نظم کا تسلسل اسکی ہم آہنگی، اس کا داخلی و خارجی تناسب، اس کا محاکاتی انداز بھی۔ غزل اور نظم کی تمام اہم خصوصیات کا یہ حسین امتزاج سانیٹ کو ایک انوکھی خوبی اور ایک نرالی کشش عطا کرتا ہے۔

معنی اور اشارے:

افلاک = فلک کی جمع - آسمان

پونجی = سرمایہ - دولت

بے مایہ	=	بے دولت - مفلس - بے حقیقت
بے نیاز	=	بے غرض - مستغنی
زہد	=	پرہیز گاری - تقویٰ
توقیر	=	عزت
حجاز	=	عرب کے ایک شہر کا نام
رندی	=	شرابی
نقاب	=	پردہ
مرحلہ	=	منزل
پیہم	=	مسلسل - لگاتار
ظلمت شکن	=	تاریکی کو دور کرنا
تادم آخر	=	آخری دم تک
صرصر	=	آندھی
بے اعتدالی	=	بے توازن
گریزاں	=	پرہیز کرنا - بھاگنا
ضمیر	=	دل
معتبر	=	بھروسے کے قابل
عدم	=	غیر حاضری - نہ ہونا - وہ عالم جہاں آدمی مرنے کے بعد جاتا ہے
راہ	=	راستہ

زبان و بیان

عزیز تمنائی کی نظم ''مسافر'' دانش فرازی کی یاد میں قلم بند کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں شاعر نے دانشؔ کی موت پر اپنے تاثرات اور جذبات کا اظہار کیا ہے اسلئے یہ رثائی نظم کہلاتی ہے۔ یہ نظم سانیٹ کی ہئیت میں ہے۔ نظم دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلے ٹکڑے میں آٹھ مصرعے ہیں اور دوسرے میں چھ مصرعے۔ اسطرح کل 14 مصرعوں میں شاعر نے اپنے خیالات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

''مسافر'' ایک تاثراتی نظم ہے اسمیں دانش فرازی کی شعری، ادبی اور علمی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ دانش کی فراغ دلی کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا امتیاز ذات اپنے چھوٹے بڑے نئے پرانے تمام شاگردوں کو علم و آگہی اور شعری و ادبی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ بقول عزیز تمنائی انہیں ذرّے سے آفتاب بنایا۔

عزیز تمنائی کہتے ہیں کہ دانش کے اندر ایک ایسی شان بے نیازی تھی کہ وہ خود سے بھی اور زمانے کی نظر سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے آپ کی فطرت میں تقویٰ اور دل میں کعبہ کا احترام تو تھا ہی لیکن غالب کی طرح دانش بھی بادہ نوشی سے دامن بچا نہ سکے۔

داغش نے ایک ایسے دور میں شاعری کی شمع روشن کی تھی جبکہ اس راہ کی تمام منزلین تاریک اور راستے خاموش ہو گئے تھے۔ آپ کے فکروفن سے صوبۂ ٹملناڈو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ آخر عمر تک آپ نے شعروادب کے لئے اپنے ذہن ودل کو وقف کر دیا تھا۔ عزیز تمنائی کی نظر میں داغش مسافر تھا اس لئے عدم کی راہ میں گم ہوگیا لیکن انہیں اس بات کا غم ہے کہ ایک اچھا انسان ہم سے بچھڑ گیا۔

نظم شگفتہ اور رواں بحر میں کہی گئی ہے۔ اس لئے تاثیر دوبالا ہوگئی ہے عزیز تمنائی نے کہیں بھی جذبے کو بے لگام نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ ابتدا سے آخر تک خیال انگیزی کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نظم میں خیالات اور جذبات کا اظہار تخیل اور فکر کی آمیزش کے ساتھ ہوا ہے۔ نظم میں علامتوں، اشاروں، استعاروں اور تمثیلوں سے اس کا شعری حسن دوبالا ہوگیا ہے۔

غور و فکر:

1) ذیل کے شعر کی نثر بنایئے:

زہد سے فطری لگاؤ، دل میں توقیر حجاز
جانے کیوں اس کو پسند آئی تھی رندی کی نقاب

2) ذیل کے شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجیے:

عدم کی راہ میں وہ مسافر گم ہوگیا تھا
اس کا تو ہے غم کہ انسان اچھا سا کھو گیا

3) مناسب جوڑ لگا کر مصرعے مکمل کیجیے:

	الف	ب
1)	وہ اچانک چل دیا	راہ میں گم ہو گیا
2)	خود سے لاپروا، زمانے کی	منزلیں تاریک تر
3)	مرحلے تاریک تھے اور	گویا سفر تھا مختصر
4)	وہ مسافر تھا عدم کی	نظر کی نظر سے بے نیاز

4) آفتاب کا قافیہ نقاب ہے اور بے نیاز کا قافیہ حجاز ہے اسی طرح ذیل کے الفاظ کا ایک ایک قافیہ لکھیے:

(شباب - ادا - نظر - ساحل - ضمیر - ارمان)

5) مختصر سوالات:

1) سانیٹ کسے کہتے ہیں؟
2) اردو میں سانیٹ کو پُل کیوں کہا گیا ہے؟
3) نظم ''مسافر'' کس کی یاد میں لکھی گئی؟
4) مسافر کو کونسی نقاب پسند آئی تھی؟

5) ''پاس جو پونجی اجالوں کی تھی سب کچھ بانٹ کر'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

6) وضاحتی سوالات:

1) مسافر میں کیا کیا خوبیاں تھیں؟

2) مسافر کے مرحلے اور منزلیں کیسی تھیں اور اس کی فکر وفن کا کیا حال تھا؟

3) ذیل کے مصرعوں کی وضاحت کیجئے:

۱) راہ کے بے مایہ ذرّوں کو بنا کر آفتاب

۲) اس کی ننھی روشنی پیہم رہی ظلمت شکن

۳) غم تو اس کا ہے کہ اک اچھا انسان کھوگیا

7) تفصیلی سوالات:

1) نظم ''مسافر'' کا خُلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے؟

2) عزیز تمنائی کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

بے کفن نعش

کمالؔ مدراسی

میں ٹہلتا تھا سمندر کے کنارے ایک شام
چل رہی تھی پے بہ پے ٹھنڈی ہوائے سحر خیز
اور اُفق پر ہر طرف جلوہ فشاں تھیں سُرخیاں
تھی مری حدّ نظر تک چادرِ ابرِ رواں
جس کے قدموں پر جھکا تھا آسمانِ کج اَدا
میں نے اس عالم میں دیکھا منظرِ شاہ وگدا
میرے دل کی طرح موجیں بیقرار و مضطرب
اُٹھ کے ٹکراتی تھیں پیہم کشتئ نادار سے
شور وغل کا ایک ہنگامہ مچا جس کے سبب
اِک برہنہ نعش لائے تھے وہاں مزدور چند
مانگتے تھے جو کفن کے واسطے ہر اک سے بھیک
ورنہ کردینی پڑے گی نعش شاید نذرِ آب

کون تھا جو تھام لیتا بے بس و مجبور کو
اپنی آنکھوں سے بہاتا خون کے آنسو کبھی
چیخ اُٹھتا ایک نعشِ بے کفن کو دیکھ کر

یہ وہی ہے جس سے حاصل ہے ہمیں نان شکم
جس کا خونِ غم ہمارے ہر رگ و ریشہ میں ہے
اور ہے اپنے وطن کی جس کے کارن آن بان

یہ نہیں تو ناز برداری اُٹھائے اپنی کون؟
کِس پر اَپنے ہم جتا سکتے ہیں احسان و کرم
کون پوجے گا بنا کر بُت ہمارے رات دِن

غرق ہی تھا اِن خیالاتِ پریشاں خیز میں
ہو رہا تھا شمسِ تاباں آسماں پر یوں غروب
میں نے یہ سمجھا سمندر اب نِگل جانے کو ہے

اس اندھیرے میں بھی دامن گیر ہے فکر غریب
جس کی قسمت تیرہ و تاریک ہے شاہوں کے ساتھ
جس کی شامِ ظُلمت آگیں کی نہیں ابتک سحر

موڑ دوں گا میں رُخ تاریخِ مزدورِ ازل !!
اس کے قدموں پر جبینِ شاہ کو کردوں گا خم
چھین لوں گا تخت و تاجِ ظالم و جابر غرور

درسِ تعمیرِ وطن سے آئے گا اِک انقلاب
ماند پڑ جائینگی ساری قوتیں تخریب کی
اور بدل جائے گا اِک دن رنج پرورده شام

کمال مدراسی

نام محمد کمال الدین اکبر اور تخلص کمالؔ ہے۔ مدراس کے ایک صاحب ثروت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ چھٹی جماعت سے شعروشاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ افضل العلماء مولانا عبدالستار صاحب مجبور کی سرپرستی نے اس کو اور ہوا دی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے آرٹس کالج، مدراس میں داخلہ لیا۔ یہاں ڈاکٹر عبدالحق، مولانا عبدالوہاب بخاری، مولانا رحیم احمد فاروقی آزادؔ اور سید فضل اللہ جیسے جید عالموں کی فیضِ تربیت نے اور جلا بخشی۔

آپ کو انگریزی شعروادب سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ طبّی تعلیم کی غرض سے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی اردو شاعری کا مشغلہ جاری

رہا۔ پنجاب اسوسیشن مدراس سے آپ کا بڑا قریبی تعلق تھا۔ آپ ہی کی نظامت میں اس اسوسیشن کے سالانہ کل ہند مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے ایک ناظم شاعرہ کی حیثیت سے بھی آپ کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

کمال مدراسی ٹمل ناڈو کے مایہ ناز غزل گو شاعر گذرے ہیں آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ رباعیات، قطعات اور سانیٹ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے کلام کے مجموعوں میں ''اعجاز کمال'' ''تاج کمال'' ''ابرار کمال'' ''فیروز کمال'' اور ''پرواز کمال'' زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

معنی اور اشارے:

نعش = لاش - میت

بے کفن نعش = بنا کفن لاش

پے بہ پے = لگا تار - مسلسل

ہوائے سحر خیز = لطف پیدا کرنے والی ہوا - جادو بھری ہوا

اُفق = آسمان کا کنارہ

جلوہ فشاں = جلوہ ظاہر کرنا - روشن نمایاں

حدِ نظر = نظر کی حد تک

ابرِ رواں	=	چلنے والا بادل
آسمانِ کج ادا	=	ٹیڑھی چال والا آسمان
شاہ وگدا	=	بادشاہ اور فقیر
مضطرب	=	بے چین
پیہم	=	لگاتار۔ مسلسل
کشتی نادار	=	بے بس کشتی
برہنہ نعش	=	ننگی لاش
نذرِ آب	=	پانی کی نذر
نانِ شکم	=	پیٹ کی روٹی
پریشان خیز	=	پریشان کرنے والے
شمسِ تاباں	=	روشن سورج
شامِ ظلمت آگیں	=	تاریکی لانے والی شام
جبین شاہ	=	بادشاہ کی پیشانی
خم کرنا	=	جھکا دینا
جابر	=	جبر کرنے والا
تخریب	=	اُجاڑنا
رنج پرورده	=	رنج وغم پالنے والا

زبان و بیان

''بے کفن لعش'' منظر کشی اور گہرے مشاہدات پر مشتمل ایک کامیاب نظم ہے۔ نظم کی ابتدا منظر نگاری سے ہوتی ہے۔ شاعر شام کے وقت سمندر کے کنارے ٹہل رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور دل کو لبھانے والی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ افق پر سرخیاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔ شاعر کو اپنی حدِ نظر تک آسمان پر بادل رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے بادل کے قدموں پر آسمان نے اپنا سر جھکا دیا ہو۔ شاعر اپنے دل کی طرح سمندر کی موجوں کو بے قرار اور بے چین پاتا ہے۔ کیونکہ ایک نادار کشتی سے موجیں بار بار ٹکرا رہی ہیں جس سے ساحل کے کنارے پر شور و غل برپا ہو گیا ہے۔ اب نظم ایک نیا موڑ لیتی ہے چند مزدور ایک برہنہ لاش لئے سمندر کے کنارے پہنچ گئے ہیں اور کفن کے لئے ہر ایک سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان کی یہ مانگ پوری نہ ہونے پر ایسا لگتا ہے کہ وہ لاش کو پانی کی نذر کر دیں گے۔ یہ دیکھ کر شاعر کا اضطراب بڑھتا ہے۔ اسے اس برہنہ لاش سے ہمدردی ضرور ہے لیکن وہاں کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا جو اس بے بس و مجبور لاش کے لئے کفن کا انتظام کرتا ایسے میں شاعر کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وہی مزدور ہے جو ہمیں

نانِ شکم فراہم کرتا ہے جس سے ہمارے وطن کی آن بان قائم ہے۔ وہ ہماری ناز برداری اٹھاتا ہے۔ ہماری پوجا کرتا ہے لیکن بقول شاعر اسکی قسمت تیرہ و تاریک ہے۔ اسلئے اسکی تاریک شام کبھی سحر میں بدل نہ سکی۔ اس دل سوز منظر کو دیکھنے کے بعد شاعر کا دل جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ قدرے انقلابی آہنگ میں تاریخ کا رخ بدل دینا چاہتا ہے اور شاہوں کو مزدوروں کے قدموں پر جھکا دینے کے درپے ہے۔ شاعر پُر امید ہے کہ تعمیر وطن کا درس ایک دن انقلاب لائے گا اور ساری تخریبی قوتوں کو ماند کر دے گا۔ مزدوروں کا رنج پر وردہ نظام خوشیوں اور مسرتوں میں تبدیل ہو جائے گا۔

یہ نظم سراپا پر تاثیر ہے۔ تسلسل اور روانی ابتدا سے آخر تک قائم ہے۔ شاعر کا اسلوب دلکش ہے۔ شاعر نے شعری صنعتوں اور اصطلاحوں کا استعمال بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ نظم کا موضوع اور فکر کی اساس ترقی پسند نظریہ پر قائم ہے۔

شعریت اور روانی کا احساس نظم کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔ موضوع و فکر مناسبت سے الفاظ کا انتخاب نظم کی تاثیر کو بڑھا دیتا ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دنیا میں اب دور سرمایہ داری ختم

ہو جائے گا اور مزدوروں کو انصاف مل کر رہے گا۔ اس نظم کا عنوان خود ایک علامت ہے انقلاب کی۔ ایک نئے نظم کی جس میں مزدوروں کو آزادی کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہو گا۔

غور و فکر:

1- ذیل کے اشعار پڑھئے اور نیچے دئے ہوئے سوالات کے مختصر جواب لکھئے:

(الف) یہ وہی ہے جس سے حاصل ہے ہمیں نانِ شکم
جس کا خونِ غم ہمارے ہر رگ و ریشہ میں ہے

1) "یہ وہی ہے" سے شاعر کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

(ب) درس تعمیر وطن سے آئے گا اک انقلاب
ماند پڑ جائیں گی ساری قوتیں تخریب کی

2) اس شعر میں متضاد الفاظ کی نشان دہی کیجئے۔

2- ذیل کے شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجئے:
نعش لائے تھے ایک وہاں برہنہ چند مزدور
جو کفن کے واسطے مانگتے تھے بھیک ہر اک سے

3- جوڑ لگائیے:

	الفاظ	=	معنی
(1)	نعش	=	روشن سورج
(2)	گدا	=	ننگا یا ننگی
(3)	مضطرب	=	نشان وشوکت
(4)	برہنہ	=	تاریکی - اندھیرا
(5)	آن بان	=	رنگ پھیکا پڑ جانا
(6)	تیرہ وتاریک	=	فقیر
(7)	ماند	=	لاش

4- مختصر سوالات:

1- شاعر کہاں اور کس وقت ٹہل رہا تھا؟

2- شاعر کو تا حد نظر کیا نظر آیا؟

3- مزدور کیا لائے تھے اور ہر ایک سے کس چیز کی بھیک مانگ رہے تھے؟

4- شاعر جبینِ شاہ کو کس کے قدموں پر خم کر دینا چاہتا ہے؟

5- انقلاب کیسے آئے گا؟ اور کونسی قوتیں ماند پڑ جائیں گی؟

5- وضاحتی سوالات:

1- شام کے وقت سمندر کے کنارے کا منظر اپنے الفاظ میں لکھیے۔

2- ایک برہنہ لاش کو دیکھ کر شاعر پر کیا گذرتی ہے؟

3- اس شعر کی تشریح کیجئے:

اس اندھیرے میں بھی دامن گیر ہے فکر غریب
جس کی قسمت تیرہ و تاریک ہے شاہوں کے ساتھ

6- تفصیلی سوالات:

1- اس نظم کا مرکزی خیال واضح کیجئے۔

2- اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے۔

اپنی جنم بھومی

سجاد بخاری

ہند کے ذی حشم عوام کے نام — پریم کا، امن و آشتی کا پیام
مذہبوں، ملتوں کا یہ سنسار — مختلف، مشکبو، گلوں کا ہار
ایکتا اور ہند کے اقوام — جیسے غزلوں میں قافیوں کا نظام
جیسے ندیوں میں بارشوں کا ملاپ — جیسے ساگر میں ندیوں کا ملاپ
اپنے تہوار آپسی بندھن — اپنے افکار پریم کا چندن

ایک بجلی نہ جانے کیسے گری
سارے گلشن میں ابتری پھیلی

ہر عمارت کی شان ہوتی ہے — گرتی مٹی کی آن ہوتی ہے
دھیرے دھیرے غبار سا اٹھا — سارے بھارت کو جس نے گھیر لیا
نفرتیں، الفتوں سے ٹکرائیں — چاہتیں، چاہتوں سے شرمائیں
بھائی بھائی سے بد گمان ہوا — کس کا ایمان، کس کا مان ہوا

چھوڑ دیتے ہیں کیوں ہوا اور کب
چند باتیں مگر ہیں غور طلب!

آنکھ ہر بار کیوں پھڑکتی ہے   آگ ہر سال کیوں بھڑکتی ہے
ڈس کے چپ چاپ یہ نکلتے ہیں   سانپ جو آستیں میں پلتے ہیں
شر پسندوں نے جب زباں کھولی   خوب کھیلی ہے خون کی ہولی
لخت جگروں کو کتنے رو کے رہے   کتنے بچے یتیم ہو کے رہے
کیا قیامت کی وارداتیں ہوئیں   نذرِ آتش ہزاروں جانیں ہوئیں
لوٹ مار اور درندگی توبہ   گھر سے بے گھر ہے زندگی توبہ

ایسی بگڑی کو پھر بنانا ہے
آخر اِس دیش کو بچانا ہے

اب گوارا نہیں ہوا دینا   چاہیئے آگ کو بجھا دینا
ضد پہ اڑنا کوئی کمال نہیں   آبرو ہی اگر بحال نہیں
ہار اور جیت اصل میں کیا ہے   اک تماشا ہے، اک تقاضا ہے
دھرم، ہٹ دھرم کب بناتا ہے   دین، انسانیت سکھاتا ہے
ان میں اکثر کیئے پہ نادم ہیں   ہم بھی کیا کم، خدا کے خادم ہیں
اس خدا کے جو کُل جہاں کا ہے   بیر آپس میں پھر کہاں کا ہے

کیا عبادت کی اور ہے شکتی
شانتی کے سوا ہے کیا بھگتی

خود نمائی نہ خود سری میں ہے | بندگی، بندہ پروری میں ہے
دونوں آگے بڑھیں گلے ملنے | مل کے بیٹھیں تو کیوں نہ حل نکلے
وہ بھی مسجد کا احترام کریں | ہم بھی مندر سے ان کو رام کریں
آن قائم تو جان قائم ہے | ہو مکیں تو مکان قائم ہے
فیصلہ جو بھی ہو عدالت کا | ختم ہو کھیل بربریت کا
اینٹ، پتھر کہیں بھی ملتے ہیں | رُک گئے دل تو پھر نہ ملتے ہیں
بھول جائیں نہ ایک منتر ہم | پیار ہی پیار رحمتِ عالم

نفسِ آدم کریم ہو جائے
آدمیت عظیم ہو جائے

سجاد بخاری

سجاد بخاری 16 ستمبر 1951ء کو شہر مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے ماموں پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی مرحوم کی نگرانی میں اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کئے۔

مدراس یونیورسٹی سے ایم-اے اردو پاس کرنے کے بعد ٹمل ادب میں بھی ایم-اے کی سند حاصل کی اور دونوں زبانوں میں ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ اردو میں ایم-فل کرنے کے بعد ''بھارتی اور اقبال'' کے موضوع

پر مدراس یونیورسٹی سے پی - ایچ - ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

سجاد بخاری ایک منجھے ہوئے ادیب اور زود گو شاعر ہیں۔ چھوٹی بحروں میں ان کی غزلیں بہت پُر لطف ہوتی ہیں۔ انہوں نے علیم صبا نویدی کے ہائیکو کا ٹمل ترجمہ کر کے ٹمل زبان و ادب کی دنیا میں بھی اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی کتاب ''پیسُم وِرلگل'' کے نام سے شائع ہو کر ٹمل حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ آپ اردو کے استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ مدرسہ اعظم میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیکر ماضی قریب میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ان دنوں آپ مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیتِ پروجکٹ فیلو ادبی الفاظ پر مشتمل کثیر اللسان لغت سازی (Multilingual Dictionary) کے کام میں مصروف ہیں۔

معنی اور اشارے

جنم بھومی	=	پیدائش کی جگہ، مادرِ وطن
ذی حشم	=	حشمت والا، شان وشوکت والا
پریم	=	پیار، محبت، دوستی، یارانہ
امن وآشتی	=	میل ملاپ صلح، سکون وآرام
ایکتا	=	یکجہتی، میل ملاپ

ساگر	=	سمندر
تہوار	=	خوشی کا دن، عید برات
ابتری	=	خرابی، گڑبڑ، بے ترتیبی، بدحالی
اپمان	=	بے عزتی
مان	=	عزت
شرپسند	=	فساد برپا کرنے والا، جھگڑالو، برائی چاہنے والا
لختِ جگر	=	جگر کا ٹکڑا، اولاد
وارِدات	=	سانحے، حادثے، ہنگامے
نذرِ آتش	=	آگ کے حوالے
آخِرش	=	آخرکار، انجام کار
ہَوا دینا	=	آگ کو بھڑکانا، فساد پھیلانا
اَڑنا	=	ٹس سے مس نہ ہونا، ڈٹنا
بحال	=	برقرار، قائم، اچھی حالت میں
نادم	=	شرمندہ، پشیمان، شرمسار
بیر	=	دشمنی، عداوت
شکتی	=	طاقت
شانتی	=	امن وسلامتی

بھگتی	=	عبادت
خودنمائی	=	خود پسندی، اپنی نمائش کرنا
خودسری	=	سرکشی، نافرمانی، ضد
بندہ پروری	=	احسان، عنایت
رام کرنا	=	راضی کرنا
مکیں	=	مکان میں رہنے والا
بربریت	=	وحشی پن، خونخواری
منتر	=	جادو کے بول
کریم	=	بخشنے والا، فیاض، مہربان
نفسِ آدم	=	انسان کی پستی، آدمی کا مزاج

زبان و بیان

اس نظم کا نفسِ مضمون عصری حیثیت کا حامل ہے۔ اشاروں کنایوں میں شاعر نے قوم کے نام یکجہتی کا پیغام دیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے کیا خوب کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے دونوں قوموں سے مخاطب ہوکر یہی بات اپنے انداز میں کہی ہے۔

بابری مسجد کے سانحۂ عظیم اور اس کے بعد ہونے والے دردناک

حالات کے پس منظر میں اس نظم کو سمجھنا چاہئے۔ شاعر نے اس نظم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شروعات میں ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور تہذیبی رنگا رنگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پھر بابری مسجد کے سانحے سے نظم دوسرا موڑ لیتی ہے کہ کس طرح اس حادثہ عظیم نے دونوں قوموں کے درمیان دراڑیں ڈالیں اور کیا کیا تباہیاں مچائیں۔ یہ بھی کہ شر پسند عناصر لگاتار قوم و ملک کا کیا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

تیسرے موڑ پر شاعر نے دونوں عظیم قوموں کے آگے اس مسئلے کا ایک خوبصورت حل بھی پیش کیا ہے اور یہی حصہ اس نظم کی کامیابی کا ضامن ہے۔ سلاست، روانی اور محاکاتی انداز بیان اس نظم کی جان ہے۔ سبک ہندی الفاظ کا برمحل استعمال نہ صرف ہندو مسلم اتحاد بلکہ ہندی اردو میل ملاپ کا بھی غماز ہے!

اس نظم کو عصری حسیّت سے لبریز ایک مختصر قومی مثنوی بھی کہا جاسکتا ہے۔

غور وفکر

1- جوڑ لگایئے:

	الفاظ	......	معنی
1)	ذی حشم	......	سرکشی - نافرمانی
2)	ایکتا	......	سانحے - حادثے

3) ایمان ...... شان وشوکت والا

4) واردات ...... بے عزتی

5) خودسری ...... یکجہتی-میل ملاپ

2- ذیل کے تین مصرعوں میں سے ایک مکمل شعر تلاش کیجیے:

کیا قیامت کی وارداتیں ہوئیں
چاہتیں چاہتوں سے شرمائیں
نذر آتش ہزاروں جانیں ہوئیں

3- اس شعر کی نثر کیجیے:

ضد پہ اڑنا کوئی کمال نہیں
آبرو ہی اگر بحال نہیں

4- شعر میں الفاظ کی الٹ پھیر کو درست کیجیے:

پھر بنانا ہے ایسی بگڑی کو
دیش کو آخرش بچانا ہے

5- مختصر سوالات:

1- ''اپنی جنم بھومی'' سے کیا مراد ہے؟

2- ہند کے اقوام کی ایکتا کو شاعر نے کن مثالوں سے واضح کیا ہے؟

3- بھارت میں کس طرح کا غبار اٹھا تھا؟

4- شرپسندوں نے کیا کہرام مچایا؟

5- شاعر کس بات پر ''توبہ'' کا اظہار کرتا ہے؟

6- شاعر نفسِ آدم اور آدمیت کے لئے کیا چاہتا ہے؟

6- توضیحی سوالات:

1- ذیل کے اشعار کی بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

1) ڈس کے چپ چاپ یہ نکلتے ہیں
سانپ جو آستیں میں پلتے ہیں

2) کیا عبادت کی اور ہے شکتی
شانتی کے سوا ہے کیا بھگتی

2- شاعر کس منتر کو نہ بھولنے کی ترغیب دلاتا ہے؟

3- ہند کے ذی حشم عوام کے نام شاعر کیا پیغام دیتا ہے؟

7- تفصیلی سوالات:

1- نظم ''اپنی جنم بھومی'' کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔

2- اس نظم کے آخری بند کی وضاحت اپنے الفاظ میں کیجیے۔

3- اس نظم کی شعری خوبیاں اجاگر کیجیے۔

رباعیات

امجد حیدرآبادی

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

— — —

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یا رب تیری رحمت کے بھروسے امجد
بند آنکھ کیے یوں ہی چلا آیا ہے

— — —

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی
قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا نام باقی فانی

— — —

ہیں خاتمِ عشق نگینہ آنکھیں
ہیں بحر محبت کا سفینہ آنکھیں
ہیں گنبد پُر نور کی صورت بالکل
کعبہ ہے اگر دل تو مدینہ آنکھیں

— — —

خالق نے جنہیں دیا ہے زر دیتے ہیں
زر کیا ہے، خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجود
ساماں نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

— — —

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا
نا فہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو اُلٹا بھی تو نادان رہا

— — —

امجد حیدر آبادی (۱۸۸۸ء - ۱۹۶۱ء)

امجد حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسۂ نظامیہ میں تعلیم پائی اور پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ چند مہینے بنگلور کے ایک مدرسے میں مدرس رہے۔ حیدر آباد لوٹ کر مدرسۂ دار العلوم سے وابستہ ہو گئے اور پھر صدر محاسبی میں خدمت انجام دینے لگے۔

ان کی پوری زندگی سانحوں کا شکار رہی۔ چالس دن کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ موسیٰ ندی کی طغیانی میں گھر بار بہہ گیا۔ ماں، بیوی اور بیٹی آنکھوں کے سامنے ڈوب مرے اور وہ خود ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ زندگی کا بڑا حصّہ تنگی ترشی میں بسر ہوا۔ لیکن ان کے صبر واستقلال اور جمعیت خاطر میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہمیشہ راضی بہ رضا رہے۔

وہ ایک صوفی شاعر تھے۔ تصوف اور اخلاق کے موضوع پر اردو میں ان سے بہتر رباعیاں بہت کم کسی نے کہی ہوں گی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں حکیم الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ اہل دکن انہیں ''زندہ سرمد'' کہتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کے مجموعوں میں ''رباعیات امجد'' اور ''ریاض امجد'' بہت مشہور ہیں۔

معنی اور اشارے:

صفات	=	صفت کی جمع = خوبیاں
بے کس	=	مجبور - محتاج
واجب	=	خدائے تعالیٰ
قیوم	=	قائم رہنے والا - خدا کا صفاتی نام
قیام	=	پائداری - سکونت - استقلال
خاتم	=	انگوٹھی
بحر محبت	=	محبت کا دریا
سفینہ	=	کشتی
سرمایہ	=	پونجی - دولت
ہم صحبت	=	ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا - ساتھی
ہم صحبت بے خرد	=	بے عقل کی صحبت - نادان کی صحبت
نافہم	=	ناسمجھ
پشیمان	=	شرمندہ

زبان و بیان

رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا، دوسرا اور

چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہو سکتا ہے۔ عام طور پر رباعی کا چوتھا مصرع سب سے زیادہ زوردار ہوتا ہے۔ اس میں پہلے تین مصرعوں کے خیالات کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ رباعی کے لئے چند بحریں مخصوص ہیں۔

اردو میں اور بھی شعراء نے رباعیات کہی ہیں جن میں انیسؔ، حالیؔ، جوشؔ، فراقؔ اور جاں نثار اختر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

امجدؔ کی رباعیوں میں تصوف، اخلاقیات اور زندگی کے حقائق بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بھی ملتا ہے۔

امجدؔ کی زبان بامحاورہ اور سلیس ہے۔ وہ عربی و فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں سے اپنی رباعیوں میں ایک خاص لطف پیدا کرتے ہیں۔

امجدؔ کی کونسی رباعی آپ کو زیادہ پسند ہے۔ اپنی پسند کے اسباب بیان کیجئے۔

غور و فکر

1- ذیل کی رباعی کو غور سے پڑھیے اور نیچے دیے ہوئے سوالوں کے جواب لکھیے۔

آنکھیں نگینہ عشق خاتم ہیں
آنکھیں سفینہ کا محبت بحر ہیں
بالکل صورت کی نور پُر گنبد ہیں
آنکھیں مدینہ تو دل اگر ہے کعبہ

1) شاعر نے آنکھوں کو خاتم عشق کا نگینہ کیوں کہا ہے؟
2) اس رباعی کی فنی خوبیاں اجاگر کیجیے۔
3) دل اور آنکھوں کو شاعر نے کس سے تشبیہ دی ہے؟

2- ذیل کی رباعی میں خالی جگہوں کو قوسین میں دیے گئے مناسب ترین قافیوں سے پُر کیجیے۔

واجب ہی کو ہے ...... باقی فانی (مدام - عوام - دوام)
قیّوم کو ہے ...... باقی فانی (نظام - قیام - انعام)
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا ...... باقی فانی (کام - جام - نام)

3- مختصر سوالات:

1) شاعر اپنے سینے میں کون کون سی چیزیں رکھ لی ہیں۔

2) شاعر کس چیز کے بھروسے پر بند آنکھ کئے چلا آیا ہے۔

3) دنیا میں کونسی چیز قائم رہے گی اور کونسی فنا ہو جائے گی۔

4) شاعر نے آنکھوں کی اہمیت کس طرح ظاہر کی ہے۔

5) زر اور گھر کون دیتے ہیں اور سر کون؟

6) بے خرد کی صحبت سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

7) کیا تعلیم سے جاہل کی جہالت دور ہو سکتی ہے۔

غزل

میر تقی میر

میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینھ تو بوچھاڑ کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی

اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرورِ خوبی
منتیں اس نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی

سرگذشت آپ ہی کس اندوہ سے سب کہتا ہے
سو گئے تم نہ سنی ہائے کہانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

میر تقی میر (۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء)

میر تقی میر آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد درویش صفت آدمی تھے میر کی نوعمری میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ دہلی آگئے جہاں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ میر 1782ء کے قریب لکھنو پہنچے۔ نواب آصف الدولہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لکھنو میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

میر کی بڑائی اس میں کہ انہوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی شاعری میں اسی سلیقے سے جگہ دی ہے جس وقار کے ساتھ وہ رنج و غم کی بات کرتے ہیں ہنستے بھی ہیں۔ ان کے شعر دل کو چھوتے ہیں۔ میر اپنی شاعری میں لفظوں کو نئے نئے رنگ سے استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہر زمانے میں مقبول رہا ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات کی نزاکت کے لحاظ سے میر تمام غزل گویوں میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔

معنی اور اشارے

پراگندہ	=	پریشان - حیران - بکھرا ہوا
ثانی	=	دوسرا
مینھ	=	برسات
بوچھاڑ	=	برسات کا کثرت سے برسنا
اشک فشانی	=	آنسو بہانا - رونا
سحر بیانی	=	جادو بیانی - خوش بیانی
عجز	=	انکسار
منتیں	=	منت کی جمع - خوشامد - سماجت
سرگزشت	=	ماجرا - قصہ - احوال - داستان
اندوہ	=	رنج و غم
حیف	=	افسوس

زبان و بیان

اس غزل کے آٹھ اشعار میرؔ کے کلام اور ان کی ذات سے متعلق ہیں یعنی میرؔ نے اپنی ذات اور کلام پر خود ہی تبصرہ کیا ہے۔

مطلع میں میرؔ نے اپنی طبیعت کی روانی پر خود ہی حیرت ظاہر کی ہے

اللہ اللہ حیرت یا تعجب کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ میرؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کی طبیعت اس قدر رواں ہے جیسے دریا میں پانی کی لہر میں تیزی سے آتی ہیں۔ اور بہہ جاتی ہیں۔ اسی طرح میرؔ جب شعر کہتے ہیں تو ایک کے بعد دوسرا شعر اور دوسرے کے بعد تیسرا شعر فوراً نازل ہو جاتا ہے۔

غزل کے دوسرے شعر میں تعلّی ہے۔ تعلّی کے معنی ہیں بڑائی برتری، شیخی اور ڈینگ۔ کبھی کبھی شاعر اپنی یا اپنے کلام کی تعریف خود کرتا ہے اور دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرتا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعے ''اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی'' ''یہاں'' ''اس کی'' میں بظاہر تعلّی نظر نہیں آتی مگر غور کریں تو بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ میرؔ اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔

غزل کے پانچویں اور آخری شعر میں اپنی ناقدری پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ میرؔ کو احساس تھا کہ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں زمانے نے ان کی اُتنی قدر نہیں کی۔

مختصر سوالات:

1- طبیعت کی وہ کونسی روانی تھی جس پر میرؔ نے ''اللہ اللہ رے'' کہا تھا؟

2- ''اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُسکی'' میرؔ نے کیوں کہا تھا؟

3- میرؔ نے اپنی سرگزشت کس طرح بیان کی ہے؟

4- شاعر نے کس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے؟

فکروعمل

1- مینھ کی بوچھاڑ اور اشک فشانی میں کیا مماثلت ہے واضح کیجئے۔
2- غزل کے پانچویں شعر میں کن متضاد کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔
3- ''آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے'' میں تشبیہ کس کے لئے ہے؟

غزل

مومنؔ

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم حرف ناصح بُرا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

امتحاں کیجئے مرا جب تک شوق زور آزما نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

مومن خاں مومن

مومن خاں کی ولادت ۱۸۰۰ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندان میں طب کی کتابیں پڑھیں نجوم میں آپکو خاصی مہارت تھی۔ شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے اصنافِ شاعری میں قصیدہ رباعی واسوخت غزل، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی ہے تاریخ گوئی میں کمال تھا بات بات میں تاریخ کہتے تھے مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں۔

مومن کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کی لحاظ سے اردو میں کم شعراء اس پایہ کے گذرے ہیں فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے ساری بات کو بھی شاندار بنادیتے ہیں کبھی کبھی الفاظ کی تکرار سے کلام میں تاثیر بڑھاتے ہیں۔ مومن کا دل عشق کی لذّت سے خوب واقف تھا اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز، تشبیہ اور اشعارے کی ندرت ان کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے کیونکہ وہ ارادت قلب اور محبت کی نفسیات کو مدنظر رکھکر شعر کہتے تھے۔ ان کی غزلیں فلسفیانہ مباحث سے بھی خالی نہیں حیات و موت کی کشاکش مختلف طریقوں پر بیان ہوئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کہیں کہیں ان کے الفاظ تخیل کا مفہوم پورا نہیں کرتے۔ ۵۲ سال کی عمر

میں کوٹھے سے گرے پانچ مہینہ بیمار رہ کر ۱۸۵۳ء میں انتقال کر گئے ۔

معنی اور اشارے

رنج	=	غصہ- دکھ- غم- ملال
وعدہ وفا کرنا	=	وعدہ پورا کرنا
راحت	=	آرام- آسائش- خوشی- مسرت
اغیار	=	غیر کی جمع- اجنبی- بیگانے- دشمن- رقیب
ناصح	=	نصیحت کرنے والا
ذوق	=	مزا- لطف- شوق- خوشی
زور آزمانا	=	طاقت کا امتحان کرنا- قوت دکھانا
تلخ کامی	=	ناکامی- نامرادی
نارسائی	=	نہیں پہنچنا
خفا	=	ناراض- ناخوش- برہم
حال دل	=	دل کا حال
دست	=	ہاتھ
دراز	=	لمبا- طویل- پھیلا ہوا
مضطرب	=	بے چین- بے قرار
صنم	=	بت- مورتی- (مجازاً معشوق)

زبان و بیان

مطلع میں شاعر کو محبوب کی سنگ دلی سے شکایت مطلوب ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ محبوب پر عاشق کی باتوں کا تھوڑا بہت اثر بھی دکھائی نہیں دیتا اسی لئے محبوب کی بے التفاتی اور سنگ دلی اردو غزل کا استعارہ بن گئی ہے۔ جب عاشق کے غموں کا دکھڑا سننے کے لئے محبوب تیار نہیں ہے تو پھر غم، راحت میں اضافہ کیسے کرسکتا ہے۔ رنج بانٹنے سے ہی ہلکا ہوتا ہے اور راحت نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا شعر مکالماتی انداز لئے ہوئے ہے۔ عاشق اور معشوق ایک دوسرے پر الزام عائد کررہے ہیں محبوب کو یہ شکایت ہے کہ عاشق اُسے اکثر بے وفا کہتا ہے۔ لیکن عاشق کا یہ کہنا بھی غلط معلوم نہیں ہوتا کہ محبوب اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اس شعر میں عاشق اور معشوق کے مزاج کو خوبصورت پیرائے میں اجاگر کیا گیا ہے۔

چوتھے شعر میں عاشق کی گلہ گذاری اور دیرینہ آرزو کو ظاہر کیا گیا ہے۔ بقول عاشق دنیا میں سب کچھ ممکن ہوسکتا ہے اگر محبوب اُس کا ہوجائے۔ لیکن بصد افسوس اُسے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ''تم ہمارے کسی طرح نہ ہوسکے''۔ عشق و محبت میں یہی سب سے بڑا المیہ ہے۔

پانچویں شعر میں عاشق کھلے عام محبوب کے سامنے یہ شرط پیش کرتا ہے کہ جب تک اس میں طاقت آزمانے کا شوق ہے اُس وقت تک وہ عاشق کا امتحان لے سکتا ہے۔ اس شعر میں عاشق کی پیش قدمی اور بے باکی اجاگر کیا گیا ہے۔

چھٹے شعر میں عاشق اپنی صاف گوئی کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میرا دم رُکنے لگتا ہے یا سانس بند ہونے لگتی ہے تو اس کا واحد سبب وہ نارسائی بتلاتا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کسی سے ناراض نہیں ہوتا۔ اس شعر میں عاشق کی صاف گوئی اور سادہ دلی کو موضوعِ فکر بنایا گیا ہے۔

ساتواں شعر مومنؔ کا مشہورِ زمانہ شعر ہے۔ اس ایک شعر نے غالب کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ اس ایک شعر کے بدلے وہ اپنا سارا دیواں دینے کے لئے تیار ہوگئے۔ اگر چہ کہ شعر میں معنوی لحاظ سے بھی کوئی گہرائی نہیں ملتی اور نہ کوئی فلسفۂ زندگی کی بات اسمیں کہی گئی ہے۔ سیدھا سادہ شعر ہے۔ اس شعر کی جان لفظ ''گویا'' ہے جس شعر کا حُسن دوبالا ہوگیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے معشوق جب کوئی میرے پہلو میں نہیں ہوتا ہے تو تمھاری یادیں تمھارا سراپا بن کر میرے پاس رہنے لگتی ہیں۔ انداز بیان کی انفرادیت ہی اس شعر کا حُسن ہے۔

آٹھویں شعر میں عاشق کی مجبوری و معذوری کو ظاہر کیا گیا ہے۔ عاشق دردِ دل کے سبب اپنا ہاتھ دل پر رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت میں وہ اپنا حالِ دل محبوب کو کیوں کر لکھے گا۔ حالِ دل لکھنے کا تقاضا اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن عاشق کی مجبوری بھی ایک چیز ہے۔

نویں شعر میں محبوب کے دامن کی درازی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ محبوب کا دامن اگرچہ دراز ہے لیکن عاشق کی مجبوری یہ ہے کہ اس کا ہاتھ وہاں تک پہنچ نہیں پا رہا ہے۔ پہلے مصرعے میں لطیف طنز کا پہلو نکلتا ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں حالت مجبوری بیان کی گئی ہے۔

دسویں شعر کا مطلب صاف ہے۔

مقطع میں مومن اپنے تخلص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لفظِ مومن کو خوب نبھایا ہے۔ اس شعر میں طنز کا انداز بھی قابل غور ہے۔ شاعر نے اس غزل کا سارا نچوڑ مقطع کے شعر میں پیش کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن کی پریشان حالی اور اس کے دکھ درد کو محبوب کے روبرو سنانا حماقت کی بات ہوگی۔ کیونکہ صنم (محبوب) خدا نہیں ہوتا۔ اس شعر میں لفظِ ''آخر'' کے محل استعمال سے شعر معنی خیز ہو گیا ہے۔ یہاں آخر کا مطلب ہے ہرگز یا کسی صورت میں۔ انداز بیان دلچسپ ہے۔

مختصر سوالات:

1- ذکر اغیار سے کیا معلوم ہوا؟

2- نارسائی کے باوجود شاعر کیا ظاہر کرتا ہے؟

3- شاعر حال دل لکھنے سے معذور کیوں ہے؟

4- بے وفا کہنے کی شکایت کون کرتا ہے؟

غور وفکر:

1- ذیل کے شعر کی تشریح کیجئے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

2- ''صنم آخر خدا نہیں ہوتا'' اس سے شاعر کی کیا مراد ہے لکھئے۔

غزل

غالبؔ

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منھ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بو الہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں، وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ باپ اور چچا کے انتقال کی وجہ سے بچپن ہی میں تنہا رہ گئے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد غالبؔ دلّی آگئے اور عمر بھر یہیں رہے۔ زندگی کے آخری دن لمبی بیماری کی وجہ سے تکلیف میں گزرے۔ غالبؔ نہایت اعلا ذہن کے مالک تھے۔ مزاجاً خوددار اور شوخ تھے۔ یہ صفات ان کے کلام اور خطوط میں بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

شعر و شاعری کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں غالبؔ اختیار کیا اور اسی تخلص سے مشہور ہوئے۔ غالبؔ کی

طبیعت میں جدّت پسندی تھی۔ وہ نئی سے نئی راہ کی تلاش میں رہتے تھے جس کی وجہ سے اُن کا ابتدائی کلام مشکل لگتا ہے۔ دوستوں کے مشورے پر انھوں نے مشکل پسندی کی یہ روش ترک کردی اور نسبتاً آسان زبان استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے شاعری میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے خیالات کی تازگی، موضوعات کی رنگارنگی، فکر کی بلندی اور الفاظ کی معنی خیزی ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ اُن کے کلام میں زندگی اور کائنات کی بہت سی نازک اور اہم باتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ان کے اشعار میں معنی کی کثرت ہے۔ کوئی موضوع ایسا ہوگا جس پر غالبؔ نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ان کے بیشتر اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔ غالبؔ اُردو کے عظیم شاعر ہیں۔

معنی اور اشارے

سنگ وخشت	=	پتھر اور اینٹ، کنکر پتھر
دَیر	=	بت خانہ
حرم	=	خانہ کعبہ، خانہ کعبہ کی چار دیواری، احترام کی جگہ
جمال	=	حسن، روپ، خوبصورتی
دل فروز	=	دل کو روشن کرنے والا
مہرِ نیم روز	=	دوپہر کا سورج

نظارہ سوز	=	نظارے کو جلانے والا
دشنہ	=	خنجر
غمزہ	=	ناز و ادا
جاں ستاں	=	جان لیوا
ناوک	=	تیر
بندِ غم	=	غم میں مبتلا ہونا، غم کی قید
حُسنِ ظن	=	کسی کے متعلق اچھا خیال
بوالہوس	=	ہوس پرست
عزّ	=	عزت، بزرگی، مرتبہ
حجاب	=	حیا، شرم، پردہ، اوٹ
پاس	=	خیال، لحاظ، ادب
وضع	=	طرز، طور طریق، ڈھنگ، ظاہری حالت
خداپرست	=	خدا کی عبادت کرنے والا، حق پرست، عابد
خستہ	=	زخمی، گھائل، خراب، بدحال، نادار

زبان و بیان

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ ''کوئی'' بظاہر عام لوگوں سے مراد ہے درحقیقت یہ چھپا ہوا اشارہ ہے محبوب کے لئے۔ کنایہ

استعمال کرنے کی بجائے شاعر نے کنایہ سے کام لیا ہے اور اس کنایے نے شعر میں ایک خاص لطف پیدا کیا ہے۔

دوسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ مندر، مسجد دروازہ اور آستاں یہ ایسے مقامات ہیں جہاں سے کسی کو اٹھا سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تو رہ گذر یعنی راستہ میں بیٹھا ہوا ہوں اسلئے رقیب کو کیا حق ہے کہ وہ مجھے یہاں سے اٹھائے۔

تیسرے شعر میں لفظ ''صورت'' شکل یا چہرہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ شاعر نے اسے طرح، مانند یا مثل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ محبوب کے جمالِ دلفروز کا یہ عالم ہے کہ سورج کی طرح اسکے دیدار کی بھی کوئی تاب نہیں لاسکتا۔ پھر وہ اپنی چہرے پر نقاب کیوں ڈالے ہوئے ہے۔

ساتویں شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کو اپنی عزت اور اپنے حُسن پر غرور ہے۔ ادھر مجھ کو اپنی وضع داری کا پاس ہے۔ اس لئے وہ خود مجھے اپنی بزم میں نہیں بلا سکتا اور میں راستہ میں اس سے نہیں مل سکتا۔ اس میں لف ونشر غیر مرتب کی صنعت پائی جاتی ہے۔

مقطع میں بظاہر اپنے ماتم داروں کو ضبطِ غم کی تلقین کر رہے ہیں۔ مگر دراصل یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کا عجب کارخانہ ہے کتنا ہی بڑا شخص مرجائے، تو

کسی کا کام بند ہوتا ہے اور نہ دنیا کی چہل پہل میں کوئی فرق آتا ہے۔ واقعی بہت عمدہ شعر کہا ہے۔

مختصر سوالات:

1- ''دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت'' کا مطلب سمجھائے۔
2- شاعر نے بیٹھنے کے لئے رہ گذر کا انتخاب کیوں کیا؟
3- دوسرے شعر میں محبوب کے چہرے کو کن کن اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔
4- محبوب کے عکسِ رخ کو شاعر کیا کہتا ہے؟
5- موت سے پہلے آدمی غم سے نجات کیوں پا نہیں سکتا؟

فکر وعمل:

1- غزل کے شعر میں حُسن اور حسنِ ظن سے کیا خوبی پیدا ہوئی ہے؟
2- غزل کے ساتویں شعر میں شاعر نے محبوب سے راہ میں نہ ملنے کی کیا وجہ بتائی ہے؟
3- غزل کے آٹھویں شعر میں ''وہ'' اور ''اس'' کے الفاظ کس کے لئے ہیں؟
4- غزل کے مقطعے میں غالب نے خود کو ''غالب خستہ'' کیوں کہا ہے؟

غزل

فانؔی بدایونی

اِک معما ہے، سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے؟ خواب ہے دیوانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے، کہ دِل رکھتا ہوں
رازِ کونین خُلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے، یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے، کوئی حیلہ مِرے مرجانے کا

تُم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ؟
آؤ دیکھو نہ تماشا، مِرے غم خانے کا

اب اسے دار پہ لے جا کے سُلا دے ساقی!
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانؔی!
زندگی نام ہے، مر مر کے جیے جانے کا

فانی بدایونی

شوکت علی خان نام ہے فانؔی تخلص ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو ہوئی آباواجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ فانی نے انٹرنس تک کی تعلیم بدایون میں حاصل کی۔ بریلی کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اس کے بعد سینٹرل کالج الہ آباد اور محمڈن کالج علی گڈھ میں ایل۔ایل۔بی کی تکمیل کی لیکن وکالت کے پیشے سے کوئی دلچسپی نہ تھی صرف باپ کے مجبور کرنے پر آپ نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا تھا طبیعت اوائل عمر ہی سے شعروسخن کی طرف مائل تھی۔

فانؔی کے کلام میں یاس وحزن وملال اس کثرت کے ساتھ ہیں کہ باقیاتِ فانی کا مقدمہ لکھتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ غالب کی مانند فانؔی کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ان کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح وتفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی ان کو غالب کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

فانی کے کلام کی ایک خاص خوبی شدتِ اثر اور معنویت ہے ان کے دیوان کا کوئی صفحہ ایسا نہ ملے گا جن میں دو چار اشعار قابل قدر نہ مل جائیں۔ فنی اعتبار سے وہ شعر کو اتنا سجاتے اور سنوارتے ہیں کہ تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے اور موجودہ دور کے بہت کم غزل گو شعراء ان کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔

معنی اور اشارے

معمّا	=	پوشیدہ - مبہم - پہیلی - پیچیدہ بات
کاہے کو ہے	=	کلمۂ استفہام - کیوں - کس لئے
راز	=	بھید - پوشیدہ بات
کونین	=	دونوں جہاں - دین و دنیا
پشیمان	=	شرمندہ - پچھتاوا
حیلہ	=	بہانہ - مکر - روزگار - کام
ساقی	=	شراب پلانے والا - حقہ پلانے والا
دار	=	خانہ - گھر - مقام
دیر	=	بت خانہ - مندر
حرم	=	خانہ کعبہ کی چار دیواری جہاں جاندار کا مارنا حرام ہے۔
چھانی	=	تلاش کی

نفس	=	سانس
عمر گذشتہ	=	گذری ہوئی عمر

زبان و بیان

زندگی کو مختلف دانشوروں اور شاعروں نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ فانیؔ کے نزدیک زندگی ایک معمّا ہے جسے نہ تو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اسے سمجھایا جاسکتا ہے۔ مطلع کے دوسرے مصرعے میں اپنے اس خیال کی توسیع کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ زندگی اتنی پیچیدہ اور کٹھن ہے کہ وہ اسے دیوانے کے خواب سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ دیوانے کے خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

دوسرے شعر میں انسان کے دل کی حقیقت اور اسکی عظمت و بڑائی کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے اس کے قصہ غم کی داستان کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اس کے پاس ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جو دونوں جہاں کا نچوڑ اور خلاصہ بھی ہے۔ اسی کی بدولت دنیا اور مافیہا کے سارے رازِ سربستہ فاش ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل ہی گویا رازِ کونین کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر زندگی کے رویّہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زندگی کو میرا وجود باعث شرمندگی ہے اسلئے وہ مرے مرجانے کا کوئی حیلہ بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہے۔ شاعر کا زندہ رہنا شاید زندگی

کے لئے ناگوار خاطر ہے۔

چوتھا شعر استفہامیہ انداز لئے ہوئے ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے یہ سوال پوچھتا ہے کہ کیا تم نے بھی کسی گھر کو رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ گھر کا رنگ بدلنا واقعی ایک تعجب خیز بات ہے۔ کیونکہ رنگ تو جاندار بدلتے ہیں بے جان نہیں اس حیرت ناک منظر کو دکھانے کے لئے شاعر، محبوب کو اپنے ہی غم خانے پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں غم خانے سے مراد شاعر کا دل ہے۔ یہ حُسن بیان خوب ہے۔

پانچویں شعر میں شاعر ساقی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیرا دیوانہ بے قابو ہو کر اکثر بہک جایا کرتا ہے۔ اسطرح بہکنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس لئے ساقی کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اسے دار پر چڑھا دے تا کہ اس کے بہکنے سے جو تکلیف دوسروں کو پہنچتی ہے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے۔

چھٹے شعر میں دیر و حرم کی گلیوں کو چھاننے کا مطلب ہے مختلف مقامات کی خاک چھاننا، ہر جگہ تلاش کرنا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس نے تیرے دیوانے کو ہر جگہ اور ہر مقام پر ڈھونڈا مگر کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دیوانوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔

مقطع کا دوسرا مصرعہ اتنا مشہور ہوا کہ یہ محاورہ بن کر زبان زد خلائق ہو گیا ہے۔ شاعر ہر گذری ہوئی سانس کو ایک میّت سے تعبیر کرتا ہے۔ ہر سانس

جو ہم لیتے ہیں اور سانس جو چھوڑتے ہیں جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو وہ ہماری دسترس میں نہیں رہتا اسی لئے شاعر زندگی کو مر مر کے جئے جانے کا نام دیتا ہے۔ انداز بیان بہت خوب ہے۔ سلاست اور روانی شعر کے دونوں مصرعوں سے ٹپکی پڑتی ہے۔

مختصر سوالات:

1- شاعر نے زندگی کو دیوانے کا خواب کیوں کہا ہے؟

2- راز کونین کس کا خلاصہ ہے؟

3- زندگی کیا ڈھونڈتی ہے؟

4- ''مرے غم خانے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

فکر و عمل:

1- شاعر نے معمّا کسے کہا تھا؟

2- زندگی پشیمان کیوں ہے؟

3- ''دیر و حرم کی گلیوں'' سے کیا مراد ہے؟

4- ہر نفس کو عمر گذشتہ کی میّت کیوں کہا گیا؟

غزل

شاد عظیم آبادی

سراپا سوز ہے اے دِل! سراپا نور ہو جانا
اگر جلنا، تو جل کر جلوہ گاہِ طور ہو جانا

ہمارے زخمِ دل نے، دل لگی اچھی نکالی ہے
چھپائے سے تو چھپ جانا، مگر ناسور ہو جانا

خیالِ وصل کو، اَب آرزو جھولا جُھلاتی ہے
قریب آنا دِلِ مایوس کے، پھر دور ہو جانا

جو میں ایسا سمجھتا، کچھ تو کرتا فِکر جینے کی
مِرا مَرنا نہ مرنا، آپ کا مشہور ہو جانا

نہ دے الزام بدمستی کا، اک اُفتاد تھی ساقی!
مِرا گِرنا، بھرے ساغر کا چکنا چور ہو جانا

خُدا بخشے، دِکھا کر اِک جھلک یوں ہی آنکھوں کی
قیامت ہے، جوانی کا مِری کافور ہو جانا

بَلا سے دِل اگر رِندوں کے ٹوٹے، رنج کیا اُس کا
شگون نیک ہے، شیشے کا، ساقی! چور ہو جانا

شبِ وصل، اپنی آنکھوں نے عجب اندھیر دیکھا ہے
نِقاب اُن کا الٹنا، رات کا کافور ہو جانا

جو سچ پوچھو، تو شآد! اپنے کیے کچھ بھی نہیں ہوتا
خُدا کی دین ہے، انسان کا مشہور ہو جانا

شاد عظیم آبادی

شآد کی ولادت عظیم آباد میں ۱۸۴۶ء میں ہوئی شآد کا خاندان عرصۂ دراز سے اپنے کمالات و شاہی خدمات کی وجہ سے مشہور و معروف ہے شاد کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ کئی مولوی حضرات نے آپکو ابتدائی کتابیں پڑھائیں لیکن تربیت سرسید احمد خاں کے ذمہ تھی۔ شآد نے اپنی ساری عمر اردو ادب کی خدمت میں گزاری ان کی کئی ایک تصانیف یادگار ہیں۔

شآد کے کلام کی سب سے ممتاز خوبی زبان کی صفائی و سادگی ہے نہایت شیریں و منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اشعار کو اتنا پُر تاثیر بنا دیتے ہیں

کہ فوراً دل و دماغ متاثر ہو جاتے ہیں لطف یہ ہے کہ روزمرہ عام فہم الفاظ میں ادق سے ادق مضامین نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں جو ان کی استادی اور کہنہ مشقی کا بیّن ثبوت ہے۔ ان کے کلام میں اخلاق، فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے عموماً اندازِ بیان میرؔ سے بہت کچھ ملتا ہے۔ شادؔ کو بہت سے کہنہ مشق اساتذہ کی صحبت حاصل رہی جسکی وجہ سے کلام میں پختگی اور مضبوطی بدرجہ اتم نظر آتی ہے یوں تو شادؔ نے اردو کی اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ اور غزل کے میدان میں انہوں نے خاص جوہر دکھائے ہیں۔ مرثیہ میں زبان و خیال کے اعتبار سے میر انیس کا تتبع کیا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں شادؔ کی غزلوں کا دیوان ان کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

معنی اور اشارے

سوز	=	جلن - سوزش - درد
سراپا	=	سر سے پیر تک
جلوہ	=	سامنے آنا - نمودار ہونا - دیدار - رونق
جلوہ گاہ	=	وہ جگہ جہاں جلوہ دکھایا جائے
طُور	=	کوہ سینا - سینا میں ایک پہاڑ جہاں حضرت موسیٰؑ پر تجلی الٰہی کا ظہور ہوا تھا

زخمِ دل	=	دل کا رنج - دل کا غم
ناسور	=	وہ زخم جو ہمیشہ رہتا ہے
وصل	=	ملاقات
الزام	=	تہمت - بہتان
اُفتاد	=	مصیبت - اچانک - سانحہ
ساغر	=	شراب کا پیالہ - جام
کافور	=	ایک نہایت تیز خوشبو کا سفید مادہ جو بطور دوا استعمال ہوتا ہے اور کھلا رہنے سے اُڑ جاتا ہے۔
کافور ہو جانا	=	اُڑ جانا - غائب ہو جانا - زائل ہو جانا
شبِ وصل	=	ملاقات کی رات
نقاب	=	گھونگٹ - بُرقع - چہرے پر ڈالنے کا پردہ

زبان و بیان

مطلع میں شاعر سوز اور نور کے الفاظ سے دو الگ الگ کیفیتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر دل سے مخاطب ہو کر یہ کہتا ہے کہ اے دل تو سراپا سوز ہے۔ سوزش و جلن تیری خاصیت ہے اس طرح جلتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسلئے تو سراپا نور ہو جا۔ کیونکہ سوزِ عشق مجازی کی علامت ہے اور نور عشق حقیقی کی۔ جب جلنا ہی مقدر ہے تو جل کر جلوہ گاہ طُور ہو جانے میں سکون و

راحت میسّر ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر کا مطلب صاف ہے۔

چوتھے شعر میں عاشق کی ایثار و قربانی کا تذکرہ مقصود ہے شاعر کہتا ہے کہ اگر عاشق کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کے مرنے سے اس کا محبوب مشہور ہو جائے گا تو وہ مزید جینے کی فکر کرتا اور معشوق کو مشہور ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کا خیال عاشق کے دل میں کبھی نہیں آیا۔

چھٹا شعر عشقیہ رنگ لئے ہوئے ہے اسمیں روزمرہ اور محاورے کا استعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عاشق اپنے محبوب سے یہ کہتا ہے کہ تو اپنی آنکھوں کی جھلک دکھا کر کچھ اس طرح غائب ہوگیا ہے جیسے جوانی کافور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ اس قیامت خیز منظر سے خدا بچائے۔

ساتویں شعر میں شاعر ساقی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ساغر اور شیشے کا چور ہونا ایک نیک شگون ہے۔

اس سے رندوں کا دل تو ٹوٹے گا ضرور مگر شاعر کو اس کا مطلق رنج نہیں ہے۔ اس شعر میں دو کیفیتوں کا اظہار ملتا ہے۔ ایک طرف ساغر و مینا چُور ہونے سے رندوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں دوسری طرف نیکوکار اسکو نیک شگون سمجھتے ہیں۔ شعر کا ماحصل یہ ہے کہ بدی، نیکی میں بدل رہی ہے۔

آٹھویں شعر میں وصل کی رات کا ایک عجیب منظر بیان کیا گیا ہے۔

وصل کی شب جب محبوب نے اپنا نقاب اٹھایا تو اس کے چہرے کی روشنی سے رات کافور ہوگئی اور عاشق کی آنکھوں کو اس وقت ایک عجیب اندھیرا دیکھنے کو ملا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ رات کا اندھیرا اجالے میں بدل گیا۔ اور شب وصل کا لطف جاتا رہا۔

مقطع میں ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جس پر ہم سب یقین رکھتے ہیں۔ انسان بذات خود لاچار و مجبور محض ہے۔ انسان اپنے کمالات اور کارنامے تو کر دکھاتا ہے۔ لیکن اس کے پس پردہ جو سوچ سمجھ اور ذہانت کارفرما ہوتی ہے۔ وہ خدا ہی کی دین ہے۔ خدا کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسان کا مشہور ہونا ایک ناممکن امر بن جائے گا۔ شعر کا انداز تخاطب بڑا ہی دلکش ہے۔

مختصر سوالات:

1- شاعر سوز بھرے دل سے کس بات کی تمنا کرتا ہے؟

2- خیال وصل کو آرزو کیا کرتی ہے؟

3- اپنی آنکھوں نے شبِ وصل کیا دیکھا ہے؟

4- انسان کا مشہور ہونا کس کی دین ہے؟

غور و فکر:

1- جلوہ گاہِ طور سے شاعر کی کیا مراد ہے لکھئے؟

2- اس شعر کی تشریح کیجیے :

بلا سے دل اگر رندوں کے ٹوٹے رنج کیا اس کا
شگونِ نیک ہے شیشے کا ساقی، چور ہو جانا

3- غزل میں ساقی اور ساغر کا لفظ بار بار کیوں استعمال ہوتا ہے؟

غزل

جگر مرادآبادی

دِل گیا، رونقِ حیات گئی
غم گیا، ساری کائنات گئی

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائگاں سعیِ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں، لیکن
اِک مسیحا نفس کی بات گئی

ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی

ترکِ اُلفت بجا سہی، ناصح!
لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی؟

نہیں مِلتا مزاجِ دِل ہم سے
غالباً دور تک یہ بات گئی

قید ہستی سے کب نجات جگرؔ!
موت آئی، اگر حیات گئی

جگر مراد آبادی

نام علی سکندر اور وطن مراد آباد ہے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ جگر کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔ جگر کی ابتدائی تعلیم وتربیت معمولی حد تک ہوئی عربی سے بالکل ناواقف تھے انگریزی بھے بہت کم جانتے تھے جگر کو شاعری ترکہ میں ملی بچپن ہی سے اس کا شوق تھا۔ جگر کی شاعری پر سب سے زیادہ داغؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ جگر کی شاعری میں کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ ہے جو کلام میں ایک امتیازی شان اور شاعر کے انہماک ذوق وجوشِ فکر کا پتہ دیتی ہے۔

جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی وروانی ہے وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ عموماً کامیاب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ تکرار بھدی اور زائد بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں ان کے موجودہ کلام میں بہت کم ہوگئی ہیں۔ ان کا رجحان اب زیادہ تر مضمون ومعنی کی طرف ہے۔

معنی اور اشارے:

رونق	=	چمک - طراوت - بہار
رونقِ حیات	=	زندگی کی رونق
کائنات	=	دنیا
رائگاں	=	بے کار - فضول - اکارت
التفات	=	توجہ - رغبت - دھیان
سعی	=	کوشش - دوڑ دھوپ
مرگ	=	موت - اجل
مسیحا	=	حضرت عیسٰی علیہ السلام کا لقب جو بطورِ معجزہ مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔
نفس	=	جان - روح - وجود - ہستی
وضع	=	ساخت - بناوٹ - شکل - حلیہ - حال - رنگ ڈھنگ
ترک	=	چھوڑنا - دست برداری
اُلفت	=	پیار - محبت - اُلفت جتانا - محبت کا اظہار کرنا
قید	=	اسیری - روک - شرط پابندی
ہستی	=	زندگی - کائنات
نجات	=	چھٹکارا

زبان و بیان

جگر کی یہ غزل چھوٹی بحر میں ہے۔ زبان و بیان میں سلاست اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہے مطلع میں شاعر نے دل اور غم دل کو حیات و کائنات کا محور و مرکز قرار دیا ہے۔ دل ہی سے زندگی کی رونق قائم رہتی ہے۔ اگر دل خراب ہوگیا تو زندگی کی ساری لذتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح غم دل سے انسانیت کا توازن قائم رہتا ہے اگر غم رخصت ہوگیا تو کائنات کے سارے جلوے ماند پڑ جاتے ہیں۔

دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ روٹھے ہوئے دل کو منانے کی کوشش ناکام ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ دل جو ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر اُسے جوڑنے کی کوشش لاحاصل ہوتی ہے۔ اسلئے دل کے معاملے میں احتیاط ضروری ہے۔

تیسرے شعر میں تلمیح بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو ایسا معجزہ عطا کیا تھا جس سے وہ مردوں کو بھی زندہ کر دیتے تھے چونکہ آج ایسی مسیحائی دکھانے والا کوئی نہیں رہا اسلئے عاشق کی موت پر دھیان دینے کی روایت بھی باقی نہیں رہی۔

چوتھے شعر میں محبوب کے طرز التفات سے محرومی کے

سبب عاشق نے اپنے غم کی کیفیت کو بدل ڈالا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔

پانچویں شعر میں شاعر ناصح سے مخاطب ہے کہ اگرچہ محبوب سے ترک الفت اختیار کرنا بجا سہی لیکن یہ بات محبوب تک پہنچے تو اسپر کیا گذرے گی۔ یہی احساس اس شعر کی جان ہے۔

مقطع میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ زندگی کے قید و بند سے آدمی کو اسی وقت نجات ملے گی جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ غالب نے اسی بات کو اسطرح کہا تھا کہ: ؎

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

موت اور حیات کے متضاد الفاظ سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔

مختصر سوالات:

1- دل اور غم کے جانے سے کیا چیزیں رخصت ہو جاتی ہیں؟

2- سعیٔ التفات رائگاں کیوں گئی؟

3- شاعر نے وضعِ غم کب سے بدل ڈالی؟

4- ''ترک الفت بجا سہی'' شاعر کیوں کہتا ہے؟

5- موت آنے سے کیا چیز رخصت ہو جاتی ہے؟

فکروعمل:

1- ''رونق حیات گئی'' یہ کیوں کہا گیا؟

2- ''اک مسیحا نفس'' سے کیا مراد ہے؟

3- موت آئی اور حیات گئی میں کس صنعت کا استعمال ہوا ہے واضح کیجئے؟

غزل

سید عظمت اللہ سرمدی

سب حشر میں رحمت کی ضیا ڈھونڈ رہے ہیں
ہم اپنے گریباں میں خطا ڈھونڈ رہے ہیں

پابندِ مکاں ہو کے یہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں
ناداں ہیں جو آنکھوں سے خدا ڈھونڈ رہے ہیں

دیکھو تو وہ خود اپنے ہی جلوؤں میں چھپا ہے
ہم جس کی شب و روز ادا ڈھونڈ رہے ہیں

کیا پوچھئے کیا حال ہے آشفتہ دلوں کا
مایوس ہیں تاثیر دعا ڈھونڈ رہے ہیں

آفت میں پھنسے ہم تو برائی سے الجھ کر
وہ اور ہیں جو اپنا بھلا ڈھونڈ رہے ہیں

رہ جائیں نہ ہم عرصۂ دنیا میں ٹھٹھر کر
پھر سوزِ دلِ گرم نوا ڈھونڈ رہے ہیں

اے سرمدؔی خستہ جگر موسمِ گل میں
ہم اس گل رعنا کی ادا ڈھونڈ رہے ہیں

سید عظمت اللہ سرمدؔی

نام سید عظمت اللہ اور تخلص سرمدؔی تھا۔ جنوبی ہند کے ایک ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ 1919ء میں ضلع کوئمبتور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ دار السلام عمر آباد سے مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔ مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء، منشی فاضل اور پھر تاریخ اسلام میں ایم۔اے کرنے کے بعد گورنمنٹ محمڈن کالج میں پروفیسر ہو گئے۔

عربی، فارسی اردو اور انگریزی پر آپ کو عبور حاصل تھا آپ کا شمار شہر کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ فن شعر سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ مولانا سید عضنفر حسین شاکر نائطی کے قابل شاگردوں میں سے تھے۔

سرمدی نے تقریباً تمام اصناف شعر میں طبع آزمائی کی ہے غزل آپ کی پسندیدہ صنف تھی۔ تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ ایک اچھے نثر نگار اور صحافی بھی تھے۔

آخری ایام میں ٹمل زبان کے قدیم شاہکار ''تروکرل'' کے

منظوم ترجمے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ٹمل زبان اور قدیم ٹمل تہذیب سے واقفیت کی بنا پر بڑی صحت اور ذمہ داری کے ساتھ کام کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور یہ معرکتہ الآرا کام ادھورا ہی رہ گیا۔

1955 یا 1956 میں آپ کو اہل مدراس نے سلطان الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ پھر 1973 میں ٹمل ناڈو نیشنل لینگویجز اکیڈمی نے مدراس میں اور بزم ادب کرشنگری نے اپنے شہر میں آپ کی غیر معمولی ادبی وعلمی خدمات کے اعتراف میں شاندار پیمانوں پر جشن سرمدی کا اہتمام کیا تھا۔ 5 جون 1978ء کو شہر بنگلور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

معنی اور اشارے

حشر	=	قیامت، روزِ حساب
ضیا	=	روشنی
گریباں	=	دامن، کپڑے کا حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے
شب و روز	=	رات اور دن
آشفتہ دل	=	پریشاں دل، غمزدہ عاشق، دردمند عاشق، پاگل عاشق
اپنا بھلا	=	اپنی اچھائی، اپنا فائدہ

عرصۂ دنیا	=	میدانِ حیات، سُست اور ٹھنڈی دنیا
سوز	=	جلن، رنج، غم، دُکھ
خستہ جگر	=	پریشان، رنجیدہ، ٹوٹا ہوا دل، عاشق
موسمِ گل	=	بہار کا موسم
گلِ رعنا	=	ایک قسم کا سرخ و زرد پھول، مراد معشوق

زبان و بیان

مطلع میں شاعر کے پیشِ نظر حشر کا میدان ہے۔ جہاں پر ساری مخلوق کی نگاہیں رحمت خداوندی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے لیکن شاعر کی بے نیازی دیکھیے کہ وہ بجائے رحمت کے اپنے گریباں میں خطا ڈھونڈنے میں مصروف نظر آتا ہے کیونکہ اُسے پوری امید ہے کہ رحمت تو نصیب ہو جائے گی مگر خطا کاری کا موقع کہاں ملے گا۔

دوسرا شعر طنزیہ پہلو لئے ہوئے ہے۔ شاعر نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو خدا کو خاص خاص مقامات پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا تو زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ انہیں اتنی بھی خبر نہیں ہے کہ خدا کو ظاہری آنکھوں سے ڈھونڈا نہیں جاتا بلکہ باطنی آنکھوں سے ہی خدا کا دیدار ممکن ہے۔ شعر میں ''یہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں'' کہہ کر شاعر نے حیرت و طنز کا اظہار بڑی

خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر نے دوسرے شعر کا جواب خوبصورت پیرایہ میں فراہم کر دیا ہے۔ جلوہ، شب و روز اور ادا یہ غزل کے تلازمے ہیں جن سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔

چوتھے اور پانچویں شعر کا مطلب صاف ہے۔ چھٹے شعر میں شاعر کی حسّاس طبیعت اور زمانہ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے شاعر کو یہ گوارا نہیں کہ دنیا میں انسان بے عمل اور مفلوج ہو کر رہ جائیں اسلئے شاعر ان کے دلوں میں تڑپ اور سوز کی کیفیت کا متلاشی ہے۔ ''سوز دل گرم نوا'' کی ترکیب شاعر کی قدرت بیان پر دلالت کرتی ہے۔

- مقطع میں ''خستہ جگر'' اور ''موسم گل'' کے استعارے بڑے ہی معنی خیز ہیں۔ شاعر اگرچہ خستہ جگر ہے لیکن اسکی تمنائیں ابھی جوان ہیں۔ جب بھی وہ موسم گل کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی معشوق (جسے وہ گل رعنا سے تعبیر کرتا ہے) کی ادائیں یاد آجاتی ہیں۔ جس کے ساتھ موسم بہار میں لطف و کیف اٹھائے تھے۔

مختصر سوالات:

1- سب لوگ حشر میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں اور شاعر کیا ڈھونڈ رہا ہے؟

2- آشفتہ دلوں کی کیا حالت ہے؟

3- شاعر شب و روز جس ادا کو ڈھونڈ رہا ہے وہ کہاں چھپی ہے؟

4- ''گل رعنا'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

فکر و عمل:

1- مطلع میں ''ہم اپنے گریباں میں خطا ڈھونڈنے'' کا کیا مطلب ہے؟

2- ''پابندِ مکان'' سے کیا مراد ہے؟

3- اپنا بھلا ڈھونڈنے والے کون لوگ ہیں؟

4- ''سوز دل گرم نوا'' کی وضاحت کیجئے؟

غزل

کاوش بدری

لباس، روح کا یوں تار تار ہے صاحب
ہر ایک شہر میں میرا مزار ہے صاحب

خدا را چھوڑ دو چاندی ہے اور سونا ہے
ہماری جیب میں تصویر یار ہے صاحب

تفنگ وتیر و سناں سے بچ تو گئے لیکن
نگاہ یار غضب کی کٹار ہے صاحب

جو زندہ گاڑتا ہے مجھ کو کورے کاغذ میں
وہ کوئی غیر نہیں رشتہ دار ہے صاحب

یہ نثری نظم کا گھوڑا ہے بے لگام سہی
غزل کا اونٹ بھی کیوں بے مہار ہے صاحب

دوا غذا کے لئے منتظر نہیں ہیں ہم
ہمیں کسی کا فقط انتظار ہے صاحب

شراب پیتا ہے کاوشؔ مگر وضو کر کے
خدا کے آگے بہت شرمسار ہے صاحب

کاوش بدری

کاوش بدری ٹمل ناڈو کے ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کا نام وے۔پا۔عبدالرزاق پاشاہ اور قلمی نام کاوش بدری ہے۔ 3 فروری 1928ء کو ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک مردم خیز علاقہ آمبور میں پیدا ہوئے۔ تامل آپ کی مادری زبان ہے۔ گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس سے 1950ء میں بی-اے کیا۔ مدراس یونیورسٹی لائبریری میں ایک طویل مدت تک ملازمت کے بعد انجینیرنگ کالج کے دفتر میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ آپ کا تبادلہ ہوگیا۔ یہیں سے 1987ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مثنوی ''قبلہ نما''، ''شردھانجلی'' اور ''کاویم'' آپ کی شعری تصانیف ہیں۔

حضرت مخدوم عبدالحق ساوی دستگیر صاحب پر ایک مختصر کتاب ''قطب مدراس'' کے نام سے 1983ء میں شائع ہوئی جو آپ کی تحقیقی صلاحیتوں کی ضامن ہے۔

1999ء میں بہار اردو اکیڈمی نے آپ کی مجموعی ادبی خدمات کے صلے میں پانچ ہزار روپیوں کے انعام سے نوازا تھا۔ میر اکیڈمی لکھنؤ نے

1993ء میں ''امتیاز میر'' کا اعزاز بخشا اور 2002ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے آپ کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دس ہزار روپیوں کے انعام سے نوازا گیا۔

معنی اور اشارے

تار تار ہونا	=	ٹکڑے ٹکڑے ہونا - ریزہ ریزہ ہونا
تصویر یار	=	معشوق کی تصویر
تفنگ	=	بندوق
تیر وسناں	=	تیر اور بھالا
نگاہِ یار	=	معشوق کی نظر
کٹار	=	خنجر
کورا کاغذ	=	سادہ کاغذ
بے لگام	=	منہ زور - سرکش - بے ادب
بے مہار	=	آزاد - بے روک
شرمسار	=	شرمندہ - نادم

زبان و بیان

مطلع میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ شاعر نے اس بات کا

اظہار کیا ہے کہ اسکی روح کا لباس کچھ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا کہ ہر ایک شہر میں اسکا مزار بن گیا ہے۔ ''روح کا لباس'' اور ''مزار'' استعارے ہیں اہل طریقت کے۔ شاعر کا تعلق چونکہ اہلِ طریقت سے ہے اسلئے وہ اپنے روحانی تصورات کو تجسیم عطا کر کے ہر ایک شہر میں اپنے روحانی وجود کا دم بھرتا ہے۔

دوسرے شعر میں معشوق کی تصویر کو چاندی اور سونے پر فوقیت دی گئی ہے شاعر اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہے کہ چاندی اور سونا جو دولت کی علامت ہیں شاعر کی نظر میں فضول ہیں اس کے برعکس اس کے نزدیک تصویر یار زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

تیسرے شعر میں معشوق کی غضب ناک نگاہ کو شاعر نے کٹار (خنجر) سے تشبیہ دی ہے۔ پہلے مصرعے میں تفنگ و تیر و سناں کے حوالے سے شاعر کہتا ہے کہ وہ ان ہتھیاروں سے تو بچ گیا لیکن نگاہِ معشوق کی تیز دھاروں کا نشانہ بن گیا۔

چوتھا شعر طنزیہ پہلو لئے ہوئے ہے۔ پہلے مصرعے میں ''زندہ گاڑنے'' کا محاورہ اور ''کورا کاغذ'' کے استعارہ سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔ شاعر کو اپنے اُس قرابت دار سے شکایت ہے جو مجلّوں اور رسالوں میں اسکی عزت و ناموس کو نشانۂ ملامت بناتا ہے۔ شاعر کو اس بات کا بہت افسوس ہے

جس کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے۔

پانچویں شعر میں شاعر نے اُن فن کاروں پر طنز کے تیر برسائے ہیں جو غزل کی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اس کے مخصوص مزاج کو بدلنا چاہتے ہیں۔ شعر میں گھوڑے کی مناسبت سے بے لگام اور اونٹ کی مناسبت سے بے مہار کے الفاظ بہت خوب ہیں۔ نثری نظم کا گھوڑا اور غزل کا اونٹ کہنا ایک نیا خیال ہے۔ شاعر کو بہت دُور کی سوجھی ہے چھٹے شعر کا مطلب صاف ہے۔

مقطع میں شاعر کی صاف گوئی قابل غور ہے۔ لوگ عموماً اپنی غلط کارکردگی پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اپنا صحیح رخ پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن یہاں شاعر کھلے طور پر اپنی خامی کو ظاہر بھی کرتا ہے اور خدا کے آگے شرمندہ ہونے کا اعتراف بھی۔

مختصر سوالات:

1- شاعر کس چیز کے تار تار ہونے کی بات کہتا ہے؟

2- جیب میں تصویرِ یار رکھنے کا کیا مطلب ہے؟

3- شاعر کن ہتھیاروں سے بچ گیا اور کس کی نگاہ کا نشانہ بن گیا؟

4- کورے کاغذ پر زندہ کون گاڑتا ہے؟

فکروعمل:

1- ''نگاہ یار'' سے کیا مراد ہے؟ شاعر نے نگاہ یار کو کس سے تشبیہ دی ہے؟

2- کونسا گھوڑا بے لگام ہوا اور بے مہار اونٹ کون ہے؟

3- مقطع میں شاعر کی صاف گوئی پر اظہار خیال کیجئے؟

غزل

حبیب اللہ شاہ

میری نظروں میں نہ اچھا نہ برا ہے کوئی
کھیل در پردہ یہ سب کھیل رہا ہے کوئی

یاد رہ رہ کے ستاتی ہے کسی کی دل کو
یاد کر کر کے مجھے بھول رہا ہے کوئی

کب بھلا ترکِ تعلق مرے کام آیا ہے
حال اک اک سے مرا پوچھ رہا ہے کوئی

جلوۂ شمعِ رخ یار! ترا کیا کہنا
جان پر کھیل کے اب جاں سے گیا ہے کوئی

میری بربادیٔ دل دیکھ کے ہنسنے والے
یہ نہ سمجھنا کہ ہمارا بھی خدا ہے کوئی

شاہؔ کیوں ڈھونڈتے ہو کون و مکان میں اس کو
کیا سمجھتے ہو رگِ جاں سے جدا ہے کوئی؟

حبیب اللہ شاہ

حبیب اللہ شاہ ٹمل ناڈو کے ایک خوش الحان، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ 19 نومبر 1943ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ نیو کالج، مدراس سے بی-ایس-سی (فزکس) کی تعلیم مکمل کر کے اسی کالج میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ تقریباً تیس سال درس و تدریس کی خدمات انجام دیکر 2002ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

اردو ادب پر آپ گہری نظر رکھتے ہیں۔ حافظہ اتنا قوی ہے کہ اساتذہ کے بیسیوں اشعار آپ کی نوک زباں پر ہیں۔ طبعیت قلندرانہ رکھتے ہیں اور مزاج میں حد درجہ بردباری اور سنجیدگی پائی جاتی ہے کم سخن ہیں مگر معرفت، طریقت اور تصوف پر گھنٹوں گفتگو کرتے ہیں۔ بزرگان دین سے متعلق آپ کی ذات گرامی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ آپ کا کلام معرفت وتصوف کے اسرار ورموز سے معمور ہے۔ غزل آپ کی محبوب صنف سخن ہے۔ غزل کی روایتی قدروں کے امین ہیں۔ آپ کے کلام میں عصری آگہی بھی ملتی ہے اور جمالیاتی احساسات کی دلکشی بھی۔ جب بھی آپ خوش الحانی سے کلام سناتے ہیں تو محفل پر وجد طاری ہوجاتا ہے۔ خاص طور پر معرفت اور تصوف کے اشعار سناتے وقت آپ کا اندازِ قلندرانہ روحانی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔

ایک محقق کی حیثیت سے بھی آپ کا مرتبہ بلند ہے آپ کی تالیف

''حیات قلندری'' آپ کی تحقیقی صلاحیتوں کی امین ہے۔ بزرگانِ طریقت سے عقیدت رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک انمول تحفہ ہے۔

معنی اور اشارے

در پردہ	=	پردے میں - چھپے ہوئے
کھیل کھیلنا	=	محاورہ ہے - شرارت کرنا
رہ رہ کے	=	وقفے وقفے سے
ترکِ تعلق کرنا	=	تعلق ختم کر لینا - بے تعلقی اختیار کرنا
حال	=	حالت
جلوۂ شمعِ رخِ یار	=	معشوق کے روشن چہرے کا جلوہ
جاں سے گیا	=	جان کھو دینا
بربادیٔ دل	=	دل کی بربادی - رنج وغم
رگ جان	=	وہ بڑی رگ جس سے تمام رگوں میں خون پہنچتا ہے۔
کون ومکان	=	دنیا جہاں

زبان و بیاں

مطلع میں شاعر اپنے ایک ذاتی خیال کا اظہار بڑے دلکش پیرایے

میں کیا ہے۔ کسی کو اچھا یا برا کہنا دنیا کی ریت ہے لیکن شاعر کے نزدیک نہ کوئی اچھا ہے اور نہ برا۔ شاعر اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہے کہ کسی کو اچھا یا برا کہنا ہی آپس میں تناؤ اور اختلاف پیدا کرتا ہے لہذا بہتری اسی میں ہے کہ نہ کوئی کسی کو اچھا کہے اور نہ برا۔ ایک طرح سے شاعر کا یہ رویہ امن و آشتی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر اس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ سب کھیل کوئی در پردہ طاقت کھیل رہی ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے صنعت تضاد کا استعمال کر کے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے قلبی تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ یاد رہ رہ کے ستانے کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر کو کسی سے قلبی تعلقات استوار ہیں جو بار بار اسکے دل کو ستا رہے ہیں۔ دوسری طرف کوئی چاہنے والا ضرور ہے جو اُسے برابر یاد کر کر کے بھول رہا ہے۔ دونوں مصرعوں میں لفظوں کی تکرار سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔

تیسرے شعر میں ''کب بھلا'' کا انداز ہی شعر کی جان ہے شاعر کو ترک تعلق اختیار کرنے کے باوجود کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہو سکا کیونکہ در پردہ کوئی ہر ایک سے اس کا حال و پتہ پوچھتا پھر رہا ہے۔

چوتھے شعر میں جلوۂ شمعِ رخ یار کی ترکیب بڑی جاندار ہے اور طرز تخاطب ''ترا کیا کہنا'' سے شعر کی معنوی اور لفظی دونوں خوبیاں اجاگر ہو گئی

ہیں۔ ''شمع رخ یار'' استعارہ ہے جو معشوق کے خوبصورت چہرے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے چہرہ کی تابانی اور جلوے کو دیکھ کر مرحبا تو کہتا ہے لیکن اس جلوۂ شمع پر کوئی پروانہ کی طرح فدا ہو کر جاں بحق ہو گیا ہے۔

پانچویں شعر میں شاعر اپنی بربادی دل پر ہنسنے والے کو متنبہ کرتا ہے کہ اسکا بھی کوئی پرسانِ حال ہے یعنی خدا ہے جو اسکی بربادی کو آبادی میں بدل دے گا۔ ممکن ہے کہ کل یہ نوبت ہنسنے والے پر بھی آئے۔

مقطع میں شاعر خود سے مخاطب ہے اور انداز تخاطب رجائیت سے بھرپور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس کو دنیا جہاں میں ڈھونڈنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ''کیا سمجھتے ہو'' کے سوالیہ انداز سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اس غزل کی ردیف ''کوئی'' بڑی معنی خیز ہے۔

مختصر سوالات:

1- شاعر کی نظروں میں کوئی اچھا اور برا کیوں نہیں ہے؟

2- درپردہ کھیل کون کھیل رہا ہے؟

3- ترک تعلق کے باوجود کوئی کیا کر رہا ہے؟

4- شاعر نے جان کس پر قربان کر دی؟

5- بربادیٔ دل پر ہنسنے والے سے شاعر کیا کہتا ہے؟

6- کون ومکاں میں ڈھونڈنے سے شاعر نے کیوں منع کیا؟
7- اس غزل کا کون سا شعر آپ کو پسند آیا؟

غور و فکر:

1- پہلے شعر کے مصرعہ اول کے ''کوئی'' اور مصرعہ ثانی کے ''کوئی'' میں کیا فرق ہے؟
2- یاد کر کر کے بھولنا سے کیا مراد ہے؟
3- ترکِ تعلق کا شاعر نے مذاق کیسے آڑایا؟
4- رگ جاں سے جدا کون نہیں ہے؟
5- ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) میری نظروں میں نہ اچھا نہ برا ہے کوئی
کھیل در پردہ یہ سب کھیل رہا ہے کوئی

(ب) شاہؔ کیوں ڈھونڈتے ہو کون ومکاں میں اس کو
کیا سمجھتے ہو رگ جاں سے جدا ہے کوئی

غزل

بدر جمالی

قطرے میں دریا، ذرّے میں صحرا دکھائی دے
وا دل کی آنکھ ہو تو تماشا دکھائی دے

تیری نظیر حُسن و ادا میں کوئی نہیں
مجھ کو بتادے کوئی جو تجھ سا دکھائے دے

اپنی بُرائیوں پر اگر جائے گی نظر
دنیا میں ہر کوئی ہمیں اچھا دکھائی دے

چھانی ہے اس لئے رہِ دیر و حرم کی خاک
شاید تمہارا نقشِ کفِ پا دکھائے دے

اپنی حیاتِ عشق پہ ڈالیں اگر نظر
نا خوشگواریوں کا پلندا دکھائی دے

گُل کی ادا چمن میں جمالؔی ہے دلپذیر
سینہ ہو غم سے چاک تو ہنستا دکھائی دے

بدر جمالی

نام بدر الحسن اور تخلص بدر جمالؔی ہے۔ 17 جولائی 1926ء کو ویلور میں پیدا ہوئے۔ ریاضی میں بی-ایس-سی کرنے کے بعد بی-ٹی کیا اور ریاضی کے استاد کی حیثیت سے سرکاری اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ مختلف سرکاری اُسکولوں میں تیس سال سے زیادہ تدریسی خدمات انجام دے کر 1984ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

شاعری میں آپ کو حضرت کمالؔی ویلوری اور علامہ محوؔی صدیقی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ علم عروض اور فن شاعری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ فارسی زبان پر بھی اچھی خاص واقفیت حاصل ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ کے ادبی مضامین کا انداز و اسلوب منفرد ہوتا ہے۔ آپ کا شعری مجموعہ ''جمالیات'' کے نام سے چھپ کر ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

تخیل کی بلندی اور الفاظ کا در و بست آپ کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے ایک طرح کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کی ایک غزل کا یہ مطلع آپ کی نازک خیالی کی بھرپور غمازی کرتا ہے:

پھولوں میں مسکرائے، تاروں میں جگمگائے
ان منزلوں سے ہو کر وہ میرے دل میں آئے

معنی اور اشارے

وا	=	کھلا ہوا - جدا
نظیر	=	مثال
رہ	=	راستہ
رہِ دیر و حرم	=	مندر و مسجد کا راستہ
نقش کفِ پا	=	پاؤں کے پنجے کا نشان - مرادی معنی معشوق کے پاؤں کے پنجے کا نشان
ناخوشگوار	=	ناپسندیدہ - ناموافق
پُلندا	=	پیکٹ - بنڈل - گٹھری
دل پذیر	=	مرغوب - پسند خاطر
چاک	=	پھٹا ہوا - کٹا ہوا - دامن یا آستین کا کھلا ہوا حصہ

زبان و بیان

مطلع میں بڑی معنی خیز بات کہی گئی ہے انسان کا ایک پہلو اسکا ظاہر ہے اور دوسرا باطن۔ ظاہری نظر صرف مشاہدہ کرتی ہے گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ اسکے برعکس دل کی آنکھ جسے باطنی نظر بھی کہتے ہیں چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی حقیقت تلاش کرلیتی ہے۔ قطرے میں دریا اور ذرّے میں صحرا کو دیکھنا ظاہری

نظر سے ممکن نہیں لیکن دل کی آنکھ سے یہ سب کچھ نظر آ جاتا ہے۔ ظاہری نظر مادیت اور باطنی نظر روحانیت کی علامت ہے۔

دوسرے شعر میں محبوب کے حسن و ادا کے بیان میں شاعر نے اپنا دعویٰ پیش کیا ہے۔

تیسرے شعر میں ایک عالم گیر حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر انسان اپنی برائیوں پر نظر کرنے لگے تو دنیا میں ہر شخص اُسے اچھا ہی نظر آئے گا۔ ایک پُر امن ماحول بنائے رکھنے کے لئے یہ شعر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

چوتھے شعر میں عاشق کی جنونی کیفیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ''نقش کف پا'' کی ترکیب سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔

مقطع سے رجائیت اور امید و بیم کا درس ملتا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ اگر آدمی کا سینہ غموں سے ہلکا ہو جائے تو اُسے ہر چیز دل پذیر اور خود اپنا چہرہ بھی ہنستا ہوا دکھائی دے گا۔

مختصر سوالات:

1- قطرے میں دریا اور ذرّے میں صحرا کب دکھائی دیتا ہے؟
2- شاعر دوسرے شعر میں ''مجھ کو بتا دے'' کا دعویٰ کیوں کرتا ہے؟
3- دنیا میں ہر کوئی اچھا کب دکھائی دیتا ہے۔

4- شاعر نے دیر و حرم کی خاک کس لئے چھانی تھی؟

فکر و عمل:

1- ''دل کی آنکھ'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2- ''سینہ ہو غم سے چاک'' تو کیا ہوتا ہے؟

3- ''نقش کفِ پا'' کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

غزل

حکیم محمد یعقوب اسلم

ان کا آنچل جو کبھی سر سے پھسل جاتا ہے
رنگ اور نور کا دریا سا ابل جاتا ہے

جو نگاہوں سے گرے اس کا سنبھلنا مشکل
آدمی گرتا ہے، اٹھتا ہے، سنبھل جاتا ہے

عمر بھر کے لئے جلنا ہے مقدر اپنا
وہ تو پروانہ ہے جو لمحوں میں جل جاتا ہے

لمحہ لمحہ کا مقدر ہی سفر ہے یا رب
کوئی پل دنیا میں آتا، کوئی پل جاتا ہے

اس لئے جلتی ہوئی شمع بجھا دیتے ہیں
جو بھی پروانہ یہاں آتا ہے جل جاتا ہے

جو ہے معصوم ضمانت بھی نہیں اس کے لئے
جو حقیقت میں ہے مجرم وہ نکل جاتا ہے

اس کی وقعت بھی بدل جائے گی اک دن اسلم
وقت کے ساتھ جو انسان بدل جاتا ہے

حکیم محمد یعقوب اسلم

محمد یعقوب اسلم کا آبائی وطن آلنگائم، ضلع ویلور ہے۔ ملازمت کے دوران اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ نے وانمباڑی کو اپنا مستقر بنالیا۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد میں تعلیم پائی۔ مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل اور بی۔اے کے امتحانات پاس کئے اور بی۔اے میں نشان امتیاز حاصل ہوا۔ ایم۔اے کی سند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول وانمباڑی میں بحیثیت اردو استاد ایک طویل مدت تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیکر 2003ء میں وظیفہ یاب ہو گئے۔

آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ایک مفکر، مدرس اور رہ نما، عکس در عکس (سوانحی خاکہ) چہروں کی دیوار (افسانے) اور رسول عربی (نعتوں اور نظموں کا مجموعہ) قابل ذکر ہیں۔

آپ کو زبان اور اظہار بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اور اپنے خیالات کو بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے آپ کی پوری پہچان ان شعری ونثری تخلیقات سے قائم ہوتی ہے جو برسوں سے ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں کے ادبی اڈیشنوں میں جگہ پاتی رہی ہیں۔ یعقوب اسلم ایک شاعر، افسانہ نگار صاحب طرز ادیب اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک اصولی اور عملی انسان بھی ہیں۔

معنی اور اشارے

آنچل	=	اوڑھنی کا پلّو - ڈوپٹے کا سرا
پل	=	لمحہ - آن - پلک جھپکنے کا وقفہ
ضمانت	=	ذمہ داری - کفالت - ضامنی
وقعت	=	عزت - اعتبار

زبان و بیان

مطلع کا شعر عاشقانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس میں معشوق کے حُسن و جمال کو رنگ و نور کا دریا کہا گیا ہے۔ شاعر کا یہ مشاہدہ ہے کہ جب کبھی معشوق کا آنچل سرک جاتا ہے تو اُسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ حُسن و جمال کا دریا اُبل آیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کی شوخ نگاہ قابل غور ہے۔

دوسرے شعر میں ایک عالم گیر حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ آدمی کی زندگی عروج وزوال سے عبارت ہے کبھی وہ گرتا ہے تو کبھی خود اٹھ کر سنبھل بھی جاتا ہے۔ چونکہ گرنا اور سنبھلنا تقاضائے بشریت ہے اس لئے آدمی کو اس میں کسی طرح کی شرمندگی بھی اٹھانی نہیں پڑتی۔ البتہ آدمی اپنے کرتوت کے سبب ایک بار آدمی کی نگاہوں سے گر جائے تو پھر زندگی بھر اُسکا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔

تیسرے شعر میں جلنا کی رعایت سے پروانہ لایا گیا ہے۔ شاعر نے انسان کی زندگی اور پروانہ کے درمیان ایک لطیف فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کے لئے عمر بھر جلتے رہنا اس کا مقدر بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان، تفکرات اور ذمہ داریوں کے چنگل میں پھنسا رہتا ہے جبکہ پروانہ بھی جلتا ہے مگر اس کا جلنا چند لمحوں کے لئے ہوتا ہے اس کے بعد وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں جلنے کی صفتِ مشترکہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔

تیسرے شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کے سفر میں لمحے لمحے کا حساب چکانا پڑتا ہے۔ اسلئے شاعر نے لمحے لمحے کا مقدر کہہ کر اسے سفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سفر میں کوئی جنم لے کر دنیا میں آتا ہے اور کوئی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

چوتھے شعر میں انسان کی صلہ رحمی اور جذبۂ ایثار کی صفات اجاگر کی گئی ہیں۔ ایک معمولی پتنگے کے لئے انسان اپنی شمع کو بجھا کر اُسے زندگی بخش دیتا

ہے اور خود اندھیرے میں رہنا گوارا کر لیتا ہے۔

پانچویں شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ آج کی خود غرض دنیا مجرموں، دھوکہ بازوں اور لیڈروں کی ہے جہاں معصوموں اور شریفوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ یہاں انصاف دولت کے بل بوتے پر ہوتا ہے اسلئے مجرم آزاد ہو جاتے ہیں اور معصوم کو کوئی ضمانت بھی نہیں دیتا۔ شعر کے پہلے مصرعے میں لطیف طنز کا احساس ہوتا ہے۔

مقطع میں شاعر ہلکی سی تنبیہہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو انسان زمانے کے ساتھ اپنا حُلیہ، اپنے طور طریق بدل لیتے ہیں۔ ان کی عزت ایک نہ ایک دن نیلام ہو جائے گی جن کے ہاں استقلال اور ثابت قدمی نہیں وہ وقت کے غلام ہو کر نفس کا شکار بن جاتے ہیں۔

مختصر سوالات:

1- معشوق کا آنچل سر سے پھسل جائے تو کیا ہوتا ہے؟

2- آدمی کا سنبھلنا کب مشکل ہو جاتا ہے؟

3- پروانہ اور آدمی کے جلنے میں کیا فرق ہوتا ہے؟

4- لوگ جلتی ہوئی شمع کیوں بجھا دیتے ہیں؟

فکر و عمل:

1- آج کے دور میں معصوم اور مجرم کی پہچان کی کیا کسوٹی ہے؟

2- ''لمحہ لمحہ کا مقدر ہی سفر ہے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3- وقت کے ساتھ بدلنے والے انسان کی کیا حالت ہوگی؟

4- ''رنگ اور نور کا دریا'' سے شاعر کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

غزل

حافظ باقوی

مقدر میں جو دُکھ تھے ان کو دے کر دلکشی میں نے
بھرم سے شان و شوکت سے گُزاری زندگی میں نے

لئے عشق و محبت کے سبھی الزام اپنے سر
تُجھے اے حُسن دی معصومیت کی تازگی میں نے

نہ دامن آس کا چھوڑا نہ دل ہی یاس کا توڑا
گزارے اس طرح لیل و نہار بیکسی میں نے

ہجوم عیش میں بھی تجھ کو سینے سے لگا رکّھا
بتا اے دردِ دل کی ہے کبھی پہلو تہی میں نے

جبھی تو پھول بن کر صحنِ گلشن میں مہکتی ہیں
سمو دی شعر و فن کی ہر کلی میں بے کلی میں نے

یہ ممکن ہے کہ حق گوئی کو سمجھیں دُشمنی ورنہ
کسی سے آج تک حافظؔ نہیں کی دُشمنی میں نے

حافظ باقوی

پروفیسر حافظ عبد الرزاق حافظ باقوی ایم-اے، راچوٹی (آندھرا پردیش) کے رہنے والے ہیں۔ آپکا وطن ثانی میل وشارم ہے۔ مدراس کے گورنمنٹ آرٹس کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ یہاں منتقل ہونے سے پہلے سی-عبد الحکیم کالج میل وشارم (ویلور) میں اسی منصب جلیلہ پر مامور تھے۔ کہنہ مشق شاعر ہیں اور با وقار معلم۔ حافظ تخلص بے سبب نہیں، حافظ شیرازی کی مانند قرآن کریم کے حافظ ہیں۔ حافظ باقوی طبعًا شاعر ہیں، رسمًا نہیں۔ ان کی ہر بات شاعرانہ ہے، ہر گفتگو دلکش۔ ان کی شاعری رنگ و آہنگ اسلوب و ادا اور موضوع و مواد ہر اعتبار سے تنوع رکھتی ہے۔

حافظ باقوی اردو شعر و ادب کی دنیا میں غیر معروف نہیں ہیں۔ بچوں اور بڑوں کے لئے ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے یا تو اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی مالی امداد سے شائع ہوئے ہیں یا اردو اکیڈمی نے خود اپنے صرف خاص سے شائع کئے ہیں۔

معنی اور اشارے

مقدّر	=	قسمت، نصیبہ
بھرم	=	عزّت، ساکھ

آس	=	خواہش، آرزو، امید
یاس	=	ناامیدی، مایوسی
لیل ونہار	=	رات اور دن
بے کسی	=	لاچاری، عاجزی، بے یاری ومدد گاری
ہجوم عیش	=	نفس پرستوں کی بھیڑ
پہلو تہی کرنا	=	کنارہ کشی کرنا، کترانا، ٹال مٹول کرنا
بے کلی	=	بے چینی

زبان وبیان:

یہ غزلِ مسلسل ہے۔ عموماً غزل میں ہر شعر معنی ومطلب کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض غزلوں میں ایک ہی خیال یا موضوع کو تسلسل کے ساتھ تمام اشعار میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ پیش نظر غزل میں حافظ باقوی نے اپنی زندگی سے متعلق چند حقائق کی ترجمانی کچھ اسی انداز سے کی ہے۔

مطلع میں یہ بات کہی گئی ہے کہ شاعر نے اپنے مقدر کے سارے دُکھ درد دے کر اپنی زندگی کو دلکشی ودلفریبی سے ہمکنار کرلیا ہے اس لئے اس نے اب تک عزت وآبرو اور شان وشوکت کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ اس شعر میں زندگی کے رجائی پہلو کو ظاہر کیا گیا ہے جو شاعر کو زیادہ عزیز ہے۔

دوسرے شعر سے شاعر کی شریف النفسی کا مظاہرہ ہوتا ہے دنیا میں بہت کم لوگ ہوں گے جو عشق و محبت کے سبھی الزام اپنے سر لیتے ہوں۔ یہاں شاعر بھی سارے الزامات اپنے سر لے کر اپنے محبوب کو معصومیت کی تازگی بخشتا ہے۔

تیسرے شعر میں روزمرہ اور محاوروں سے لطفِ شعر دوبالا ہو گیا ہے۔ مفہوم تقریباً مطلع سے ملتا جلتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں لیل ونہار بے کسی کو گزارنے کی بات کہی گئی ہے۔

چوتھے شعر میں طرز تخاطب خوب ہے۔ شاعر کی نیک سیرت اور پاکیزہ طبیعت کا اندازہ اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ نفس پرستوں کی بھیڑ میں شاعر نے اپنی پاک دامنی پر کبھی کوئی داغ آنے نہ دیا۔ اس لئے وہ دل کی بجائے دردِ دل سے مخاطب ہو کر قوتِ ارادی کی شہادت طلب کرتا ہے۔

چوتھے شعر میں ''ہر کلی میں بے کلی'' کہنے کا انداز بہت خوب ہے۔ صحن گلشن، پھول، کلی اور بے کلی یہ سب غزل کے تلازمے ہیں جن کو بڑے سلیقے کے ساتھ اس شعر میں برتا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ شاعرانہ تعلّی سے مراد کسی چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔

مقطع میں شاعر نے سادہ دلی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی حق گوئی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لوگ اسے دشمنی پر محمول کریں تو کریں لیکن حقیقت

یہ ہے کہ اس نے کبھی کسی سے دشمنی نہیں کی۔

مختصر سوالات:

1) شاعر نے اپنے مقدر کے دکھ کسے دیے تھے؟

2) عشق و محبت کے سبھی الزام شاعر نے اپنے سر کیوں لئے؟

3) لیل و نہار بے کسی کس طرح گزارے؟

4) ''ہجومِ عیش'' سے کیا مراد ہے؟

فکر و عمل:

1) ''تجھ کو سینے سے لگا رکھا'' سے شاعر کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

2) تیسرے شعر میں ''دامن اور دل'' کی بات کس طرح کہی گئی ہے؟

3) شاعر پہلو تہی کی بات کس سے کہتا ہے؟

4) مقطع میں شاعر کا مدعا واضح کیجئے؟

غزل

اصغرؔ ویلوری

مدت کے بعد آج جو ہم بولنے لگے
پیوست دل میں جو بھی تھے غم بولنے لگے

تم نے زباں پہ مہر لگادی تو کیا ہوا؟
جو ہم کو بولنا تھا قلم بولنے لگے!

سجدے کئے تھے ہم نے تری رہگذر میں یوں
گھبرا کے تیرے نقشِ قدم بولنے لگے

ایسا بھی ایک نام مرے لب پہ آگیا
جو بے زبان تھے وہ صنم بولنے لگے

لوگوں نے زود گوئی کا الزام دے دیا
ہم اپنے دوستوں میں بھی کم بولنے لگے

کیا میری بے گناہی کا کافی نہیں ثبوت
آخر ترے ہی دستِ ستم بولنے لگے!

اصغر ویلوری

آپ کا نام اسمٰعیل بیگ اور اصغر تخلص ہے۔ آپ ویلور میں 29/جولائی 1931ء کو پیدا ہوئے۔ ویلور سے تعلق رکھنے کی بناء پر آپ خود کو ویلوری کہلاتے ہیں۔ 1949ء میں اصغر نے ویلور کو خیر باد کہا اور مدراس میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے مدراس یونی ورسٹی سے بی-اے پھر ایم-اے، بی-ایل کی سندیں حاصل کیں۔ آپ سدرن ریلوے میں بحیثیت قانونی مشیر ملازمت میں آئے اور ترقی پاکر سینئر سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک ترقی کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

اصغر ویلوری بڑے خوش لحن شاعر ہیں۔ آپ کی غزلیں عموماً چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں ہوتی ہیں۔ آپ نے قطعات اور رباعیات کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت چونکہ رباعی کی طرف زیادہ مائل رہی اس لئے انہوں نے رباعی کو اپنی فکر وفن کا ذریعہ بنالیا۔

اصغر ویلوری کے فکر وفن پر علامہ اقبالؔ کی گہری چھاپ ہے آپ ایک صالح اقدار کے حامل کامیاب شاعر ہیں۔

اصغر ویلوری کے مجموعۂ کلام ''حروف'' ''نقوشِ اصغرؔ'' اور ''کھلے الفاظ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت وفن پر مشتمل

مضامین کا مجموعہ ڈاکٹر محمد علی آثر نے ترتیب دیکر شائع کیا ہے جو اصغر ویلوری کے فکر و فن کا شناخت نامہ ہے۔

معنی اور اشارے

پیوست	=	ملا ہوا - جڑا ہوا - چبھا ہوا
مہر لگانا	=	بند کر دینا - seal لگا دینا
رہگذر	=	راستہ - گذر گاہ
نقشِ قدم	=	پیروں کے نشاں
صنم	=	بت - مورتی - بے جان - محبوب
زود گوئی	=	بہت بولنے والا
دستِ ستم	=	ظلم کرنے والا ہاتھ - ظلم کا ہاتھ

زبان و بیان

مطلع میں شاعر نے بڑے خوبصورت انداز سے اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ شاعر نے ایک مدت سے کچھ نہیں کہا لیکن جب وہ بولنے لگا تو اس کی آواز میں غم شامل ہو گیا اور اس طرح غم کا اظہار ہونے لگا۔

دوسرے شعر میں شاعر ظالموں سے مخاطب ہے کہ تم نے زباں پہ مہر لگا دی ہے اور مجھے بولنے سے روک دیا لیکن ہم نے قلم کا سہارا لیا اور اپنے

خیالات کو ظاہر کر دیا۔ اسی خیال کو فیض احمد فیضؔ نے یوں ظاہر کیا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زبان میں نے

تیسرے شعر میں شاعر نے اپنے شوقِ جنون اور جذبۂ وارفتگی کی ایک مثال پیش کی ہے کہ محبوب کی راہ گذر میں اس شوق سے والہانہ سجدے کئے کہ خود نقش قدم بولنے لگے، رہنمائی کرنے لگے تاکہ محبوب تک پہنچ سکیں۔

آخری شعر میں شاعر نے اپنی بے گناہی کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ خود ظالم کے ہاتھوں سے آواز آئی کہ ہاتھ ظالم ہیں۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستین کا

مختصر سوالات

1- مدت کے بعد جب شاعر بولنے لگا تو کیا ہوا؟
2- زبان پر مہر لگا دی گئی تو شاعر نے کونسا ذریعہ اظہار خیالات کے لئے اختیار کیا؟

3- بے زبان صنم کب بولنے لگے؟

4- لوگوں نے زود گوئی کا الزام دیا تو شاعر نے کیا کیا؟

5- شاعر کی بے گناہی کا ثبوت کس نے دیا؟

غور وفکر

1- شاعر نے اپنے غم کا اظہار کرنے کے لئے کیا انداز بیان اختیار کیا؟

2- ''رہگذر کے سجدوں'' اور ''نقشِ قدم'' میں کیا ربط ہے؟

3- ''زود گوئی کا الزام'' اور ''کم بولنا'' دونوں میں کیا تعلق ہے کہ جس سے شعر میں حسن پیدا ہوا؟

4- ''دست ستم'' اور ''بے گناہی'' سے شعر میں زور کس طرح پیدا ہوا؟

مرزا غالب کے اخلاق و عادات

خواجہ الطاف حسین حالی

وسعتِ اخلاق:

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے دوست ہر ملّت اور مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، ان کی ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمّے فرضِ عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوط کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ

ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروّت:

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہء غایت تھا۔ باوجودیکہ آخر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے گھبرانے لگے تھے، بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر کسی اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں، جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں شاہ شرف بوعلی قلندر کو بہ سبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنّت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔ باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

فراخ حوصلگی:

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے، اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد

ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے ہوگئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا، اس لئے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقومِ جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب انکو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی سقیم حالت ہوگئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں

نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر جاڑا شدّت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

حافظہ:

جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی، اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتہ میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ مخالف لکھی تھی، ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا

یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہ لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔

حسنِ بیان اور ظرافت:

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا، مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا، پیر و مرشد، ایک نہیں رکھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکاں پر ملنے آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کو لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے

ان کو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا:

که آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکی است

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بہ سبب شرق رُویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرعہ پڑھا:

ایں خانہ تمام آفتاب است

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ بھی موجود تھے۔ انھوں نے سوداؔ کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا۔ میں تو تم کو میری سمجھتا تھا اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اٹھتے بیٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی، جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہؔ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے، مولانا بھی وہاں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقیّد رہتا ہے مگر

آج اس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہوگیا۔ ''قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقیّد رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے۔''

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف کی تیار ہو جاتی۔

خودداری:

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ شہر کے امراء وعمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی ان کے مکان پر نہیں جاتے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفٰے خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا۔ ''آپ مکان سے سیدھے ہی یہاں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟'' مرزا نے کہا۔ ''مجھ کو ان کا ایک آنہ دینا تھا۔ اس لئے اوّل وہاں گیا تھا۔ وہاں سے یہاں آیا ہوں''۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ

کہ ''آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ مارے شرم کے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں''۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے آئے۔

دادِ سخن:

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اس کے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا ہو یا برا، برابر تحسین و آفرین کی جاتی ہے اور اچھے اور برے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی۔ مرزا کی عادت بالکل اس کے خلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزّز و محترم آدمی ہو، جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا، وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے۔ آخر عمر میں تو ان کا ثقلِ سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر سخن سن لیتے تھے، مگر جب تک کوئی شعر ان کے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ ان کے بعض معاصرین اس بات آزاردہ رہتے تھے اور اسی لئے ان کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، مگر باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی، شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا اس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغہ کی حد کو پہنچ جاتی

تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوقِ سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی، ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کو سنانے کو پڑھا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا بھیّا۔ تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوقؔ کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا، کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے دیتا۔ اس شعر کو بھی انہوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سوداؔ کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے:

دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں حسنِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داؔغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف میں ان کا دل بڑھانے کے لئے حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انھوں نی آخر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اس کی بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں رشک کرنے کے قابل ہوتا، تم محسود ہوتے اور میں حاسد۔
(ماخوذ از: یادگارِ غالبؔ)

مولانا الطاف حسین حالؔی:

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی 1837ء میں پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کرنے کے بعد دلّی آئے۔ جہاں درسیات سے فراغت حاصل کی ان ہی دنوں وہ مرزا غالب کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ مولانا حالی نواب مصطفٰے خاں

شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے اور آٹھ سال تک ان کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد لاہور گورنمنٹ بک ڈپو میں ترجمہ کے کام پر مامور ہوئے جہاں جدید اردو کے پیش رو مولانا محمد حسین آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی اور ان کے دل میں بھی اردو زبان و ادب کی اصلاح اور ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ سر سید احمد خاں سے ملاقات کے بعد مولانا حالی مسلمانوں کے قومی شاعر ہو گئے۔ ان کی کتاب مسدس حالی کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور 1914ء میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

مولانا حالی ایک کامیاب شاعر اور اعلیٰ پایہ کے نثار تھے۔ غالب اور سر سید کے طرز تحریر کو زندہ رکھنے میں ان کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ مولانا کی تحریر صاف، سادہ، بامحاورہ اور مؤثر ہوتی ہے۔ ان کی نثر پر پیامی رنگ غالب ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سلجھا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ نثر میں یادگار غالب، حیات جاوید، حیات سعدی اور مقدمہ شعر و شاعری آپکی تصانیف ہیں۔ مولانا حالی کا یہ مضمون یادگار غالب سے ماخوذ ہے۔

معنی اور اشارے:

اشتیاق	:	شوق، آرزو، تمنا

یگانگت : اتفاق، قرابت

فرضِ عین : نہایت ضروری کام، ضروری فرض

باز نہ آنا : نہیں چھوڑنا

مروّت : اخلاق سے پیش آنا، انسانیت کا برتاؤ کرنا

غایت : غرض، مطلب، منتہا، آخر

متوقع : امیدوار، توقع رکھنے والا

فراخ : کشادہ، وسیع، بڑا

بساط : حوصلہ، ہمت، وسعت

خلعت : وہ پوشاک جو بادشاہ یا امراء کی طرف سے بطورِ عزت افزائی ملے

مع : ساتھ (عربی لفظ)

عمائد : عمّاد کی جمع ستون مراد بڑے بڑے لوگ

سقیم : بیمار

فرغل : روئی دار لبادہ (لباس)

چغہ : جبّہ

دَرّاکی : مغزِ سخن کو بہت جلد اور بہت خوب سمجھنے کی صلاحیت

جودت : ذکاوت، ذہانت، لیاقت

سرعت	:	جلدی، تیزی
سرانجام دینا	:	مکمل کرنا، تکمیل کو پہنچانا
حیوان ناطق	:	منطقی اصطلاح میں بولنے والا جانور مُراد انسان
درون	:	اندر
تاریکی	:	اندھیرا
خانہ	:	گھر
آفتاب	:	سورج
است	:	ہے (فارسی لفظ)
آزردہ	:	رنجیدہ، خفا، ناراض، ناخوش
مقید	:	بند، قید کیا گیا، قیدی، اسیر
تردّد	:	شک، تذبذب، اندیشہ، پس وپیش
ضخیم	:	موٹا، بڑے حجم والا
نالائقی	:	بے وقوفی
ثقل	:	بوجھ
سماعت	:	سننا
چشمک	:	مخالفت، رنجش

زبان وبیان:

خواجہ الطاف حسین حالی نے اس مضمون میں مرزا غالب کے اخلاق و اعادات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ غالبؔ دوستوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اور کبھی دوستوں سے بیزار نہ ہوتے تھے آپکو خطوط لکھنا بہت پسند تھا بہت سارا وقت خطوط کے جواب دینے میں گذارتے تھے ہر فرقے کا آدمی آپ سے الفت ومحبت رکھتا تھا۔

دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آپ کی آمدنی بہت کم تھی اس کے باوجود کبھی بھی آپ نے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا مرزا غالب بہت ذہین اور چالاک تھے کسی عبارت کو ایک مرتبہ پڑھتے تو وہ دل میں نقش ہوجاتی تھی آپ کو فارسی زبان پر کافی عبور حاصل تھا آپ دوستوں کے ساتھ مذاق بھی کرتے تھے۔

قلیل آمدنی کے باوٌجود آپ میں خودداری تھی آپ بازار میں بغیر پالکی کے نہیں جاتے تھے۔ جو شخص اُن کے گھر آتا وہ بھی ان کے گھر جاتے۔ آپ کوئی اچھا شعر سنتے تو خوب داد دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف

میں ان کا دل بڑھانے کے لئے حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔

غور و فکر:

1- ذیل کے جملوں کو مناسب ترین جوڑ سے پورا کیجئے:

1) ہر ایک خط کا جواب لکھنا مرزا غالب اپنے ذمّے .... سمجھتے تھے۔

(الف) فرض عین

(ب) واجب

(ج) فرض کفایہ

2) اگر کوئی مرزا کے ملفوظات جمع کرتا تو ایک .... لطائف کی تیار ہو جاتی۔

(الف) رسالہ

(ب) پرچہ

(ج) ضخیم کتاب

3) بعض اوقات وہ اپنے .... کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے۔

(الف) دوستوں

(ب) عزیزوں

(ج) شاگردوں

2- اس سبق میں بعض الفاظ صیغۂ جمع میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے ''خطوط''۔ یہ لفظ خط کی جمع ہے۔ اس طرح کے اور لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ اور ان کے واحد صیغے نیچے دئے جاتے ہیں۔ آپ انہیں ذہن نشیں کر لیجئے:

واحد	-	جمع
عماد	-	عمائد
استاد	-	اساتذہ
برہان	-	براہین
امیر	-	امراء
حد	-	حدود

3- ذیل کی عبارت کو غور سے پڑھئے اور نیچے دئے گئے سوالوں کے مختصر جواب لکھئے:

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے، اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے ہوگئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔

1) مرزا کی آمدنی کتنی تھی؟
2) ان کے مکان کے آگے کس قسم کے لوگ ہر وقت پڑے رہتے تھے؟
3) غدر کے بعد ان کے کھانے پینے کا خرچ کیسا تھا؟
4) غدر کے بعد مرزا کی ماہانہ آمدنی کتنی تھی؟

4- مختصر سوالات:

1) مرزا ہر شخص سے کس طرح ملتے تھے؟
2) مرزا دوستوں کو دیکھ کر کیا ہوتے تھے؟
3) ان کے خطوط سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟
4) لوگ انہیں کس قسم کے خط بھیجتے تھے؟
5) مرزا کا حافظہ کیسا تھا؟
6) کیا مرزا کتابیں خرید کر پڑھتے تھے؟
7) رمضان کے بعد قلعہ میں بادشاہ نے ان سے کیا پوچھا؟
8) شاگردوں کے کلام سے متاثر ہو کر وہ کیا کہتے تھے؟

5- وضاحتی سوالات:

ذیل کے جملوں کی بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

1- اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔
2- میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھے معاف کریں۔

3- اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

4- جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔

5- آخر عمر میں تو ان کا ثقل سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

6- تفصیلی سوالات:

1- مرزا کی وسعتِ اخلاق کی وضاحت کیجیے؟

2- مرزا کی دلچسپی خطوط سے کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟ تبصرہ کیجیے۔

3- مرزا کی فراغ دلی کا واقعہ پیش کیجیے؟

4- مرزا کی خودداری پر سیر حاصل بحث کیجیے؟

5- مرزا کے داد دینے کا طریقہ کیا تھا؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے؟

عزت

خواجہ حسن نظامی

عزت انسان کا ایک خیال ہے، جس کو آبرو کہتے ہیں۔ قدر و منزلت، وقار و وقعت اور ناک، مان، بھرم، ساکھ، بات، وغیرہ مختلف الفاظ میں بھی اس کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ وہ بڑے آبرودار ہیں۔ ان کی بہت قدر و منزلت ہے۔ ان کے وقار اور وقعت کی بات ہے۔ اپنی ناک کی خاطر یہ کام کیا۔ مان کا پان بھی کافی ہے۔ ان کا بھرم بہت تھا۔ ان کی ساکھ گھر گھر تھی۔ ان کی بات بنی ہوئی تھی وغیرہ فقرے ہماری بول چال میں مروّج ہیں جن کا مطلب عموماً عزّت ہے۔

عزّت ایک خیالی چیز ہے۔ مگر یہ خیال دنیا کی سب قوموں اور ہر درجہ کے آدمیوں میں رنگا رنگ طریقوں سے پایا جاتا ہے۔ اور ایک آدمی بھی اس فطری جذبہ سے خالی نہیں ہے۔ جو لوگ عزت سے بے پروا سمجھے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو بے پروا کہتے ہیں، وہ بھی اس خیال سے آزاد نہیں ہیں۔ فرق صرف طرز اور طریقہ کا ہوتا ہے۔ ورنہ عزت کا خیال ہر قسم کے انسانی اور بعض قسم کے حیوانی دماغوں پر مسلط ہے۔

دنیا کے بادشاہوں کی تاریخیں اس قسم کے واقعات سے لبریز ہیں

کہ حکومت کے اعزاز کی خاطر باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو، بھائی نے بھائی کو، ماں نے بیٹے کو، بیٹے نے ماں کو، خاوند نے بیوی کو، بیوی نے خاوند کو بے تامّل و بڑی بے رحمی و ترسی سے قتل کر دیا۔ اور ان کو نسب و قرابت کا ذرا بھی خیال نہ آیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عزت کی خواہش دنیا کی محبتوں پر بڑا زبردست غلبہ رکھتی ہے۔ بادشاہوں ہی پر منحصر نہیں ہے، متوسّط اور عام درجہ کے آدمیوں میں بھی ذاتی رسوخ اور ذاتی عزّت کی بنا پر مذہب اور رشتہ داری کو قربان کرنے کی بے شمار مِثالیں پائی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روپیہ اِن سفاکیوں کا باعِث ہوتا ہے۔ مگر یہ غلط خیال ہے۔ کیونکہ روپیہ بھی عزت حاصل کرنے کو کمایا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

حشمت مٹے جلال مٹے کرّ و فر مٹے
مال و منال سارا مٹے یا کہ زر مٹے
صنعت مٹے کمال مٹے یا ہنر مٹے
مٹ جائیں سب بلا سے نہ عزت مگر مٹے
ایک آبرو کے جینے پہ انسان مر مٹے

دنیا میں حرص، طمع، فساد، خونریزی، خودغرضی، جلادی، سفاکی اور تمام قسم کی برائیاں محض عزت کے تحت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو قناعت، امن، رحم دلی اور ہر طرح کی نیکیاں بھی عزت کے ماتحت

نظر آتی ہیں اور عزت ہماری دینی و دنیوی زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور ہمارے تمام اعمال کا مرکز اور نقطۂ نظر ہے۔

عزت وہی اچھی ہے جو ذلتوں اور گناہوں کی زیادہ تعداد خرچ کئے بغیر حاصل ہو۔ سب سے اچھی عزت وہ ہے جس کے عوض کسی قسم کی ذلت، کسی قسم کا گناہ سرزد نہ ہو، اور وہ عزت حاصل ہو جائے۔ دولت کے دروازے سے جو عزت آتی ہے اس میں بہت ظلم کرنے پڑتے ہیں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت خودغرضی و بے مروّتی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اور ایسی شدید جسمانی و روحانی تکالیف کے بعد وہ عزت میسّر ہوتی ہے جن کا کچھ حد و حساب نہیں ہے۔

بادشاہوں کی عزت اسی قسم کی عزت ہے۔ ان کے تاج و تخت، ملک و فوج، زر و جواہر تو سب کو نظر آتا ہے۔ ان کے آگے جھکی ہوئی گردنوں کو تو سب دیکھتے ہیں۔ مگر یہ خیال کسی کو نہیں آتا کہ بادشاہ نے کتنے ظلم، کتنی محنت، کتنی خودغرضی و بے مروّتی اور کس قدر جسمانی و روحانی تکلیف کے بعد ان عزتوں کو حاصل کیا ہے اور پھر ان عزتوں کے برقرار رکھنے میں جن افکار کا مقابلہ بادشاہ کو کرنا پڑتا ہے وہ ایسے سخت ہوتے ہیں کہ یہ عزتیں ان کے مقابلہ میں بالکل ناچیز اور نکمّی نظر آتی ہیں۔ پھر بھی انسان ایسا عزت پرست واقع ہوا ہے کہ رات دن اس کو سوا خواہش اعزاز کے اور کچھ کام نہیں ہے۔

گرمی کے موسم میں ایک دفعہ راقم چھتری لگائے دریائے جمنا کے کنارے جا رہا تھا۔ وہاں دیکھا ایک مچھلی والا جال سے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ تیز دُھوپ کے سبب سے اس کے چہرے کی حالت دگرگوں ہے۔ اور اس کے بشرے سے بہت تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ راقم نے پوچھا: کیوں میاں مچھلی والے تم آرام سے ہو یا میں۔ بولا تم آرام سے ہو۔ مجھ کو آرام کہاں نصیب۔ صبح اندھیرے یہاں آیا تھا۔ دوپہرے ہونے کو آئی اب تک گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ دھوپ میں بیٹھا تپ رہا ہوں۔ اب بازار جاؤں گا۔ مچھلیاں فروخت کروں گا۔ آٹا دال خریدوں گا۔ بال بچوں میں جاؤں گا۔ روٹی پکے گی۔ جب ٹکڑا میسّر آئے گا۔ تم چھتری لگائے آرام سے گھر جاؤ گے- تیار کھانا، برف کا ٹھنڈا پانی، خس کی ٹٹیاں، پنکھے، نوکر چاکر موجود ہوں گے۔ آرام تم کو ہے، مجھ کو کہاں۔ راقم نے کہا: بھائی جس روپیہ سے یہ چیزیں مہیا ہوتی ہیں اس کے حاصل کرنے کی فکر ان تمام راحتوں اور آراموں سے زیادہ تکلیف کی چیز ہے۔ تمہاری بے فکری بھی ایک ہے اور فکر بھی ایک۔ مچھلی پکڑنا اور بیچ ڈالنا اور گھر جا کر پاؤں پھیلا کر سونا اور چین کرنا، میری راحتیں بھی زیادہ ہیں اور تکلیف بھی۔ مگر راحتیں تکلیفوں سے کم ہیں اور میں بہت مہنگے داموں میں آرام خریدتا ہوں۔

یہی عزت کا حال ہے کہ وہ نافہموں کو بہت گراں دستیاب ہوتی

ہے۔ البتہ جو لوگ حساب لگا کر اور حد و معیار مقرر کر کے حصول عزت کی کوشش کرتے ہیں انہیں زیادہ گھاٹا نہیں ہوتا۔

دولت کے دروازہ سے عزت کو بلانا بے عقلوں کا کام ہے۔ عاقل وہ ہیں جو علم و ہنر اور کسی ذاتی کمال کے دروازے سے عزت کو طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ان کو دولت کی عزت کی طرح ستم گاریاں اور تکلیفیں پیش نہیں آتیں۔

جس کے پاس دولت نہ ہو اِس زمانے میں وہ سب ذلیلوں کا ذلیل ہے اور کوئی عزت اس کی نہیں ہے۔ لیکن ایک کامل شاعر باوجود مفلسی کے جب اپنا کلام سناتا ہے تو لوگوں میں خود بخود اس کی عزت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ اس کی مفلسی کو نہیں دیکھتے۔ ایک کامل طبیب اگر بے زر ہو تب بھی اس کے ہنر کے سبب خلقت اس کی عزت کرتی ہے۔ تیراک، کمہار، سنار، لوہار اگر اپنے فن میں صاحب کمال ہیں تو انھیں دولت مند ہونا ضروری نہیں۔ اپنے ہنر کی وجہ سے وہ ممتاز ہیں۔ ایک عالم یا ایک درویش کیسا ہی مفلس اور شکستہ حال ہو عزت دار اور بڑے بڑے دولت مندوں کا مرجع ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اس میں علم یا درویشی کا جوہر ہوتا ہے جو لوگ فانی عزت کے حریص نہیں ہوتے اور اپنی انسانی عزت کو خدا کی عزت کے ماتحت رکھ کر بندوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی عزت پائدار ہوتی ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتی۔ یا جو لوگ کوئی خاص فن یا ہنر

کمال کے درجے کا جانتے ہیں ان کی عزت بھی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

ہندوستان میں ہمایوں، اکبر، شاہ جہان کے بڑے بڑے شاندار مقبرے ہیں۔ اور زندگی میں بھی وہ بڑے عزت دار تھے۔ مگر آج جو لوگ ان مقبروں پر جاتے ہیں تو صرف عمارت کو دیکھ کر چلے آتے ہیں۔ بادشاہوں کی عزت کا انہیں خیال تک نہیں آتا۔ لیکن تارک اعزاز فقرا کے مزاروں پر رات دن عزت اور تعظیم سے لوگ سر جھکاتے ہیں اور ان کی عزت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور نامور شعراء علما اور باکمال لوگوں کی عزتیں بادشاہوں سے زیادہ قائم ہیں۔ غالب بہت مفلس شاعر تھے۔ اکبر شاہ اور بہادر شاہ بادشاہ کی سی دولت ان کو میسر نہ تھی۔ مگر آج جو غلغلہ اور جو عزت غالبؔ کے کمال کو حاصل ہے وہ بہادر شاہ کے نام کو میسّر نہیں۔ بادشاہ جو اپنی عزت کی حد مقرر کرتے ہیں حقیقی عزت دار بن جاتے ہیں اور جو حد مقرر نہیں کرتے وہ عموماً ظالم حریص اور خود غرض ہوتے ہیں۔

جو درمیانے درجے والے لوگ اپنا لباس اپنا مکان اپنا کھانا اور اپنا رہنا سہنا عزت کا معیار بنا کر مقرر کرتے ہیں وہ کبھی ذات کی تکلیف نہیں اٹھاتے۔ وہ معیار یہ ہے کہ اپنے سے پست لوگوں کو دیکھ کر اپنی عزت کی حد بنائیں اور اپنے سے اعلیٰ لوگوں پر عزت کا قیاس نہ کریں۔

شادی غمی کی رسموں میں عزت کا خیال بہت آیا کرتا ہے اور انسان

اپنی عزت کی حد مقرر نہ کرنے کے سبب اکثر ایسی فضول خرچی کرتا ہے جو بساط اور حیثیت سے زیادہ ہوتی ہے جس کا نتیجہ بعد میں جا کر سخت سے سخت ذلتوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی آدمی ناک اور عزت کی خاطر قرض لے کر شادی میں خوب دھوم دھام کرتا ہے اور عزت کی مقررہ حد نہ ہونے کے سبب خرچ کرنے میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔ اس وقت بے شک اس کو ایک طرح کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ مگر بعد میں قرض اور فضول خرچی کی بدولت اس کو گھر اور جائداد کے نیلام یا قید کی جسمانی تکلیف اور بدتر بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو چند روزہ عزت کے مقابلہ میں بہت زیادہ اور بہت طویل ہوتی ہے۔

حاصل مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں عزت کے خیال سے آزاد ہونا ممکن نہیں ہے اور عزت کی طلب انسان کی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ مگر کامیاب عزت دار وہ ہیں جو عزت کو تول کر حاصل کرتے ہیں۔ اور وزن مساوی سے زیادہ عزت کے لئے ذلت نہیں اٹھاتے اور تکلیف خرچ نہیں کرتے۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ صاحب 1778ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کا نام علی عرف حسن نظامی ہے۔ مضمون نگاری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ طبیعت

میں خاص جدّت ہے۔ معمولی سے معمولی موضوع کو مضمون کے ٹھوس قالب میں ڈھال لیتے ہیں جس میں ایک خاص انوکھا پن ہوتا ہے۔ مثلاً ''فرم قبلہ تو شملہ''، ''مچھر کا اعلان جنگ'' وغیرہ۔ یہ مضامین کچھ ایسے دل آویز اسلوب سے قلم بند کیے ہیں جو آپ ہی کا حصّہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی اپنے دور کے ایک زبردست مصنف اور ادیب تھے۔ آپ کی سو سے زیادہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو میں شاید ہی کوئی ادیب اتنی کتابیں لکھا ہو۔ اردو میں انشائیہ کی صنف کو مقبول عام بنانے میں خواجہ صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ آپ ان کی کتاب ''سی پارہ دل'' کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس خوبی سے ایک مختصر مضمون اور بے جان چیز مثلاً ''لالٹین یا برف'' وغیرہ سے وہ سوتے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔

1918ء میں آپ نے اخبار ''رعیّت'' نکالا۔ دلّی میں ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا۔ آپ کا انداز تحریر اپنے اندر ایک خاص ندرت اور تاثیر رکھتا ہے۔ عبارتوں میں بلا کی آمد اور روانی ہوتی ہے۔ فقرے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں جن میں ہلکی ہلکی مزاح اور طنز کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ حسن نظامی کا انتقال 31/ جولائی 1955ء میں ہوا۔

معنی اور اشارے:

وقار و وقعت	=	عزت، بھرم - وقار و وقعت مترادف الفاظ ہیں
مسلّط	=	حاوی
لبریز	=	بھرا ہوا
اعزاز	=	عزت
نسب	=	نسل، سلسلۂ خاندان
قرابت	=	رشتہ داری
رسوخ	=	رسائی، ربط ضبط
سفّاکی	=	ظلم، خون ریزی
حشمت	=	بزرگی، عظمت، شان وشوکت
کرّ و فر	=	ٹھاٹ باٹ، دھوم دھام
مال ومنال	=	دولت، اسباب
طمع	=	حرص، لالچ
قناعت	=	جو مل جائے اس پر راضی رہنا
سرزد ہونا	=	واقع ہونا، صادر ہونا، عمل میں آنا
افکار	=	فکر کی جمع
دگرگوں	=	الٹ پلٹ، تہہ و بالا

بُشرہ	=	چہرہ، حُلیہ
نافہم	=	ناسمجھ، نادان
گراں	=	بھاری
دستیاب ہونا	=	حاصل ہونا
خلقت	=	مخلوق
تیراک	=	تیرنے کا فن جاننے والا
شکستہ حال	=	برا حال
مرجع	=	جائے پناہ، ٹھکانا جہاں سب رجوع ہوں
پائدار	=	مضبوط
تارک اعزاز	=	عزت کو ترک کرنے والا
غلغلہ	=	شہرت، ناموری، عزت
حریص	=	حرص کرنے والا

زبان و بیان:

ہم نے اکثر اپنے بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''عزت کے ساتھ جیو اور عزت کے ساتھ مرو''۔ اس مختصر سے فقرے میں انسانی زندگی کا سارا نچوڑ آ گیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے اس مضمون میں زندگی کے ایک ایسے ہی مرکزی پہلو کو جسے آپ اور ہم ''عزت'' کے نام سے جانتے ہیں بڑے ہی

پُرمغز انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں عزت کا نہ صرف مفہوم بیان کیا گیا ہے بلکہ خواجہ صاحب نے عزت کے لئے استعمال ہونے والے مختلف الفاظ کی نشان دہی بھی کی ہے اور اس کا مروجّہ محلِ استعمال بھی بتایا ہے۔

عزت کمانے کے خاطر دنیا میں لوگوں کو کیا کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک اس خیال سے آزاد نہیں ہے۔ فرق صرف طرز اور طریقہ کا ہوتا ہے۔ مصنف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ عزت کی خواہش دنیا کی محبتوں پر زبردست غلبہ رکھتی ہے۔ بادشاہوں پر ہی منحصر نہیں ہے۔ متوسط اور عام درجے کے آدمیوں میں بھی ذاتی رسوخ اور ذاتی عزت کی بنا پر مذہب اور رشتہ داری کو قربان کرنے کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

اس مضمون میں خواجہ صاحب نے دولت اور علم کی بدولت حاصل کی جانے والی عزت کا تقابل بھی پیش کیا ہے اور عزت کمانے کے لئے لوگ کیا کیا حربے اور کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں ان کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔

جھوٹی عزت اور شان کے خاطر کس طرح لوگ قرض لیکر دھوم دھام کی شادی رچاتے ہیں اور بعد میں فضول خرچی کی بدولت اپنی جائداد کے نیلام یا قید کی جسمانی تکلیف اور بدتر بے عزتی کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔

حسن نظامی کا یہ مضمون بڑا ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس میں لطیف طنز کے اشارے بھی ملتے ہیں اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی یہ آراستہ پیراستہ ہے۔

غور و فکر

I قوسین میں دیے گئے مناسب الفاظ سے خالی جگہوں کو پُر کیجیے:

1) عزت کی خواہش دنیا کی محبتوں پر بڑا زبردست .... رکھتی ہے۔

(حربہ - راستہ - غلبہ)

2) دولت کے .... سے جو عزت آتی ہے اس میں بہت ظلم کرنے پڑتے ہیں۔ (دروازے - کھڑکی - سرمایہ)

3) .... وہ ہیں جو علم و ہنر اور کسی ذاتی کمال کے دروازے سے عزت کو طلب کرتے ہیں۔ (عامل - عاقل - عادل)

II مناسب ترین جواب تلاش کیجیے:

(الف) زر و جواہر تو سب کو

1. اچھا لگتا ہے
2. نظر آتا ہے
3. گرویدہ بناتا ہے

(ب) آج جولوگ ان

1. درگاہوں پر جاتے ہیں

2. مقبروں پر جاتے ہیں

3. تفریح گاہ پر جاتے ہیں۔

III مناسب جوڑ لگا کر جملہ پورا کیجئے:

1) ناموَر شعراء، علماء اور باکمال لوگوں کی - وہ سب ذلیلوں کا ذلیل ہے

2) جس کے پاس دولت نہ ہو اس زمانے میں - عزت کا خیال بہت آیا کرتا ہے

3) شادی غمی کی رسموں میں - ایک خیال ہے

4) عزت انسان کا - زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہے

5) عزت کی طلب انسان کی - عزتیں بادشاہوں سے زیادہ قائم ہیں

IV مختصر سوالات:

1) عزت کا مفہوم کن الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔

2) عزت کے لئے کونسے فقرے ہماری بول چال میں مروّج ہیں۔

3) بادشاہوں کی تاریخیں کس قسم کے واقعات سے لبریز ہیں۔

4) عزت کے تحت دنیا میں کونسی برائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

5) عزت کو ہمارے تمام اعمال کا مرکز اور نقطۂ نظر کیوں کہا جاتا ہے۔
6) سب سے اچھی عزت کونسی ہے؟

V توضیحی سوالات:

ذیل کے اقتباسات بحوالۂ متن تشریح کیجئے:

1) ''دولت کے دروازے سے جو عزت آتی ہے اس میں بہت ظلم کرنے پڑتے ہیں۔''
2) ''ایک کامل طبیب اگر بے زر ہو تب بھی اس کے ہنر کے سبب خلقت اسکی عزت کرتی ہے۔''
3) ''تارک اعزاز فقراء کے مزاروں پر رات دن عزت اور تعظیم سے لوگ سر جھکاتے ہیں۔''

VI تفصیلی سوالات:

1) شادی غمی کی رسموں میں عزت کا خیال کرتے ہوئے روپیہ کس طرح صرف کرتے ہیں اور نتیجہ کیا ہوتا ہے؟
2) عزت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اسکی خوبیوں کی نشان دہی کیجئے۔
3) ایک مچھلی والے سے حسن نظامی نے کیا سوال کیا؟ اور مچھلی والے نے کیا جواب دیا؟
4) بادشاہوں کی عزت کس طرح حاصل کی جاتی ہے؟
5) مضمون ''عزت'' کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

مُردہ بدست زندہ

فرحت اللہ بیگ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہی۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مرگیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسمارہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ''واہ جیتے جی تو دوستی ومحبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرگیا''۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے۔ میرے ساتھ آیئے۔ آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجئے۔ سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں، غریب بھی ہیں، امیر بھی ہیں، بے چارے غریب تو اندر جابیٹھے ہیں، کچھ پڑھ بھی رہے ہیں، جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا

دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے ''کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے''۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے کچھ اُدھر۔ آگے آگے جنازہ ہے، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں۔ یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی، مرنے والے کے کچھ واقعات بیان

کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں، اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کپڑے بدل خاص اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سنیے۔ اگر میّت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں

بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے، مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا ادھر واپس ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات وممات ان ہی کے تفویض کردیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کردیں۔ موٹرنشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہی کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے، اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مرکر ان کی پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجارہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہورہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنادیا ہے۔ قبرستان کیا ہے خاصا جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقّے صاحب ان کی بیوی، دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلّیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیّات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی

گھانس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنالیے ہیں۔ نیم، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں تک کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترہ کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہی۔ غرض کس میپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مُردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمّت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصہ کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمھارے مُردے جانیں۔

میاں سقّہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیے۔ خیر کیا حرج ہے، زندوں کا کام بھی نکل گیا، مردے بھی خوش

ہو گئے۔ اس گھر مین سل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں۔ بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بے چارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔ اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیے ہیں۔ ٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا، اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں تُرم بج گیا۔ سقّے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے، لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی، کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت

سنیے۔ جنازہ لا کر لبِ گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے، ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو بخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقّے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سُلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے، سُلفہ پر سُلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرما شرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ

نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا کچھ ان کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لیے جا رہے ہیں غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے، اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میّت کے اوپر کی چادر سمیٹی، چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میّت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا۔ سنبھال کے میّت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو، ہاں آہستہ سے۔ اب میّت قبر کے منہ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے۔ ''ذرا کمر

کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پا کھانہ گرے۔ ہاں ہاں ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ، میّت بھاری ہے۔ ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ، بس بھئی بس''۔ کوئی چیخ رہا ہے۔ مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا بس بھئی بس۔

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بے چارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں، کیا نہ کریں، بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست واحباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ ''یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو''۔ کوئی کہتا ہے۔ ''لاحول ولا قوۃ۔ مفت میں سو روپے مار لیے اور کڑیاں دیں تو ایسی''۔ غرض کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ ''منہا'' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں

کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزّہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بے چاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں کہ ''آپ کی وجہ سے دوسری میّت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا''۔ بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میّت کا رنگ۔ جو میں غرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ:

مرزا فرحت اللہ بیگ، دہلی میں 1883ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج سے 1903ء میں بی-اے پاس کیا۔ کچھ

عرصے بعد ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد چلے گئے۔ حیدر آباد میں انہیں عزت، شہرت، دولت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لہٰذا تا حیات وہیں قائم رہے۔ 27/اپریل 1947ء کو ان کا انتقال حیدر آباد میں ہوا۔

فرحت اللہ بیگ اردو کے صف اول کے ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے دہلی کی تہذیب پر بہت کچھ لکھا۔ ان کے مضامین تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ''نذیر احمد کی کہانی: کچھ میری کچھ ان کی زبانی''۔ ''دہلی کی آخری شمع (یادگار مشاعرہ)'' اور ''پھول والوں کی سیر'' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

معنی واشارے:

ظاہر داری	:	دِکھاوا - نمائش
ہمسایہ	:	پڑوسی
تعزیت	:	پرسہ - دلاسہ
رائے زنی	:	کسی کے بارے میں اظہار خیال کرنا
اجرت	:	مزدوری
طبابت	:	علاج معالجہ (یونانی طریقۂ علاج)
وضع داری	:	ڈھنگ - طریقہ - عادت کی پابندی کرنا

تفویض	:	حوالے
شوفر	:	ڈرائیور
وحشت	:	اداسی - خوف - ہیبت
بلّیات	:	بالائیں - مصیبتیں
تعویذ	:	اینٹوں یا پتھروں کا نشان جو قبر کے اوپر بناتے ہیں۔
سقّہ	:	بہشتی - پانی پلانے والا (قبرستان میں پانی کا منتظم)
سیج	:	بستر - بچھونا
کانگڑے	:	ایک مقام کا نام جہاں زلزلہ آیا تھا۔
فوج میں ترم بج گیا	:	ایک قسم کا باجا - بگل - منہ سے بجانے کا آلہ (سب کو متوجہ کرنا)
لبِ گور	:	قبر کے قریب - قبر کے کنارے
پٹاؤ	:	چھت - تختہ - کڑی
ریویو	:	تبصرہ - جائزہ (Review)
حقہ	:	تمباکو پینے کا آلہ جس میں گڑ گڑ آواز پیدا ہوتی ہے۔
سلفہ	:	حقہ کے چلم میں ڈالا جانے والا تمباکو۔

خفتگانِ خاک	:	مٹی پر سونے والے۔
کتبہ	:	قبروں پر لگایا ہوا پتھر جو لکھوا کر یا کھدوا کر لگاتے ہیں۔
دادِ سخن گوئی	:	شاعری کی تعریف
مشغلہ	:	مصروفیت - دل بہلانے کی بات - ہنسی اڑانے کا موقع
متمکن	:	بیٹھے ہوئے - جگہ پکڑے ہوئے
تنقیح	:	تفتیش و تحقیق کرنا
تنقید	:	تبصرہ کرنا - نکتہ چینی کرنا
اعزہ	:	(عزیز کی جمع) بھائی بند - رشتہ دار
دق کرنا	:	تنگ کرنا - ستانا
غل غپاڑہ	:	بے حد شور - حد سے زیادہ چیخ و پکار - ہنگامہ

زبان و بیان:

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طنزیہ مضمون ''مردہ بدست زندہ'' حقیقت میں حالات اور اقدار کے بدل جانے کا ایک منظر نامہ ہے۔ جس میں حقیقت حال کی ترجمانی کی گئی ہے۔ فرحت اللہ بیگ کہتے ہیں کہ انسانوں کے دلوں سے اب محبت و خلوص ختم ہو گیا ہے اور ظاہر داری و ریا کاری پیدا ہو گئی

ہے۔ آج کل لوگ کسی کے جنازے میں اس لئے شریک ہوتے ہیں کہ مرحوم کے رشتہ داروں سے ملکر اپنی حاضری کا ثبوت دیں۔ فرحت اللہ بیگ اس مضمون میں ہمیں اپنے ساتھ اس لئے لے چلتے ہیں کہ آج کل کے لوگوں کی نفسیات اوران کے اقدار سے واقف کرائیں جومرحوم کی دیدار اور تجہیز و تکفین کے لئے گھر اور قبرستان میں جمع ہوتے ہیں۔ اسطرح اس مضمون میں انتقال سے لیکر قبرستان میں مُردے کی تدفین تک کے سارے منظر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اجاگر کیے گئے ہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ کسی کے انتقال پر جمع تو ہو جاتے ہیں لیکن بیشتر نہ تعزیت کا اظہار کر پاتے ہیں اور نہ پُرسا دیتے ہیں بلکہ سگریٹ پیتے ہوئے یا پان کھاتے ہوئے دنیا جہاں کی باتوں میں مصروف نظر آنے لگتے ہیں۔

اگر جنازے کے ساتھ دو چار آدمی ہوں تو کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ کس کا انتقال ہوا ہے؟ لیکن جنازے کے ساتھ لوگوں کا ہجوم زیادہ نظر آئے تو ہر کوئی یہ دریافت کرتا ہے کہ جنازہ کس کا ہے؟ کار اور موٹر والوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ جنازے کی پرواہ کیے بغیر بھیڑ کو چیرتے ہوئے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جنازہ جب قبرستان میں داخل ہوتا ہے تو لوگ قبرستان میں

چبوتروں اور قبروں پر بیٹھ جاتے ہیں سگریٹ اور بیڑی پینے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پارلمنٹ کے اجلاس اور کانگریس کے کسی جلسے میں شرکت کر رہے ہیں۔ قبرستان کے مکان دار جسے سقّہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بال بچوں کے حالات بھی اس مضمون میں بیان کئے گئے ہیں۔

جب تدفین ہوتی ہے تو ہر شخص آوازیں کسنے لگتا ہے اور اپنے مفت مشوروں سے نوازتا بھی ہے۔ لوگ تدفین کے بعد مرحوم کے رشتہ داروں کو بڑی بے مروتی کے ساتھ وہیں چھوڑ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے اس مضون میں طنز کے لطیف نشتروں کی بوچھاڑ اور منظر نگاری کے عمدہ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اسلوب کی دلکشی اور انداز و بیان کی دلآویزی مضمون کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

غور و فکر:

I- مندرجۂ ذیل جملوں کو موزوں الفاظ سے مکمل کیجیے:

1- سچی محبت کی جگہ .... نے لے لی ہے۔

2- پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تو ایسا رنج ہوتا گویا اپنا .... مر گیا۔

3- اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ .... مر گیا۔

4- لیجئے .... ختم ہوئی اور دلی رنج کا اظہار ہو چکا۔

5- جائے عبرت کو جائے .... بنا دیا ہے۔

II- ان الفاظ کی ضد لکھیے:

1) محبت ×

2) رنج ×

3) ثقہ ×

4) متمکن ×

5) تصدیق ×

III- حصۂ (الف) کو حصۂ (ب) کے موزوں جملے سے مکمل کیجئے:

حصۂ (الف)	حصۂ (ب)
1) نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے	1) اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس
2) ہر چبوترہ ایک پارلمنٹ ہے	2) اور ہم کیا کر رہے ہیں
3) یہ تو ساتھ والوں کا حال تھا	3) چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں
4) مفت کرم داشتن کی صورت ہے	4) اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے
5) یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں	5) اب راستہ والوں کی سنئے

IV- مختصر سوالات:

1) زمانے نے دلوں سے کیا مٹا دیا ہے؟

2) لوگ جنازے میں کس لئے چلے جاتے ہیں؟

3) جنازہ کے ساتھ جانے والے کتنے حصوں میں بٹ گئے؟

4) وضع داری پر قائم لوگ کیا کرتے ہیں؟

5) جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوں تو دکاندار کیا کرتے ہیں؟

V- توضیحی سوالات:

1) جنازہ کو جاتا دیکھ کر موٹر نشین کیا کرتے ہیں؟

2) سقے کے بال بچوں اور گھر بار کا کیا حال تھا؟

3) سقہ کو پھولوں کی سیج کس طرح میسر آتی ہے؟

4) خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو کیسے رزق پہنچاتا ہے؟

5) چبوتروں پر بیٹھے ہوئے لوگ کیا کرتے ہیں؟

VI- تفصیلی سولات:

1) فرحت اللہ بیگ نے پرانے زمانے اور موجودہ زمانے میں کیا فرق محسوس کیا؟

2) کسی صاحب کے انتقال پر امیروں اور غریبوں کے طرزِ عمل میں کیا فرق ہوتا ہے؟

3) موٹر والے اپنا پٹرول بچانے کے لئے کیا کرتے ہیں؟

4) جنازہ لبِ گور پہنچنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

5) جنازہ قبر میں رکھتے وقت کیا شور ہوتا ہے اور لوگ کیا کہتے ہیں؟

6) فرحت اللہ بیگ اس مضمون میں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

7) ''مُردہ بدست زندہ'' اس مضمون کا ''حاصلِ مطالعہ'' اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

ڈیجیٹل ٹکنالوجی

پروفیسر سید عبدالوہاب

زمانہ قدیم سے بنی نوع انسان اور اس کے عوامل وسیع تر بنیادوں پر دو متضاد زمروں میں بٹے ہیں۔ نیک اور بد، اچھا اور برا، صحیح اور غلط مثبت اور منفی امیر اور غریب بڑا اور چھوٹا اور نہ جانے کتنے اعتبارات ہیں جن کے لحاظ سے ان کی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہی۔ انسانی عوامل کی طرح ''ایک'' اور ''صفر'' دو متضاد اعداد (Digits) ہیں جو منطقی اعتبار سے اعلیٰ اور ادنیٰ، ہاں اور نہ On اور Off کے مترادف ہوتے ہیں۔ ڈیجیٹل الکٹرانکس کی زبان میں تار میں برقی رو بہہ رہی ہو تو اس کے معنی ایک کے اور اگر نہیں بہہ رہی ہو تو صفر کے ہوتے ہیں۔ متضاد حالتوں پر مشتمل صفر اور ایک کی جوڑی کمپیوٹر میں اطلاعات کو محفوظ رکھنے، ان کی پراسسنگ عمل میں لانے اور انہیں ظاہر کرنے میں استعمال ہوتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی بدولت مختلف امور کی انجام دہی کے لیے جب الکٹرانک مشینوں کا چلن عام ہوا تو وقت کے تقاضوں نے ڈیجیٹل ٹکنالوجی کو فروغ دیا جو ان مشینوں کی کارکردگی میں بہت بڑے انقلاب کا باعث

بنی۔ صفر اور ایک کے ذریعہ عمل پذیر تمام مشینیں اور نظام ڈیجیٹل ٹکنالوجی ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ کمپیوٹر میں سب سے پہلے ڈیجیٹل پراسسنگ کو 1940ء کے دہے میں اس وقت روبہ عمل لایا گیا تھا جب پٹرولیم انڈسٹری کو مکمل طور پر سگنل سے مربوط کیا گیا۔

مشینوں کے ذریعے طے پانے والے مختلف امور، نظاموں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ایک انالاگ (Analog) نظام اور دوسرا ڈیجیٹل نظام۔ میکانی گھڑی انالاگ نظام کی ایک اچھی مثال ہے جس میں سکنڈ کی سوئی بغیر کسی وقفہ کے مسلسل گھومتی رہتی ہے۔ بیشتر انسانی امور انالاگ نظام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جیسے دیکھنا، سننا وغیرہ۔ یہ ایسے عوامل ہیں جن میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ڈیجیٹل نظام کے تحت طے پانے والے امور توقف کی ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس نظام پر عمل پیرا کوارٹز کی گھڑیوں کی سوئی ٹھر ٹھر کر توقف سے گھومتی ہے۔ جب کہ ڈیجیٹل گھڑیاں وقت کو اعداد میں بتلاتی ہیں جو انالاگ گھڑیوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہوتا ہے۔

دور حاضر میں شائد ہی کوئی شعبہ حیات ایسا ہو جس میں استعمال ہونے والے آلات اور مشینوں میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ آج ہم ایک ڈیجیٹل دور سے گزر رہے ہیں۔ مختلف اغراض کے لیے استعمال میں لائے جانے والے ڈیجیٹل آلات، ڈیجیٹل

گھڑیاں، ڈیجیٹل کیمرے، فوٹوگرافی اورویڈیوگرافی نظام، ڈیجیٹل ساؤنڈ، ڈیجیٹل ریڈیو، ٹی۔وی ریکارڈنگ اور براڈکاسٹنگ نظام، ڈیجیٹل تھیٹر، ڈیجیٹل کمپیوٹر، کمپاکٹ ڈسک (CD)، ڈیجیٹل ویڈیو ڈسک (DVD)، ڈیجیٹل فون، فیکس، ای میل، انٹرنیٹ اور تمام مواصلاتی نظام اسی ٹکنالوجی پر کاربند رہتے ہیں۔

صدیوں سے انسان اپنا مدعا بول چال اور تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتا آرہا ہے۔ ٹیلی فون اور ریڈیائی مواصلات کا استعمال اس مقصد کے لیے وہ سالہا سال سے کر رہا ہے۔ عصر حاضر میں ڈیجیٹل الکٹرانک مواصلات اس کے لیے ایک اہم ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ جس میں اطلاعات کو اعداد صفر اور ایک میں بھیجا جاتا ہے جو ڈیجیٹل اطلاعات کہلاتی ہیں۔ ڈیجیٹل اطلاعات بہت ہی مختصر اور کثیف ہوتی ہیں جنہیں بڑے ہی سلیقے کے ساتھ اطلاعاتی نٹ ورک پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی بہم پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ مواصلات کا ایک سہولت بخش، وقت بچانے والا، سستا طریقہ ہے جس میں طرفین کی مرسلہ بات چیت محفوظ رہتی ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ ڈیجیٹل مواصلات کسی دو انسانوں کے بیچ ہی میں ہو۔ یہ امر کسی دو مشینوں کے درمیان بھی وقوع پذیر ہوسکتا ہے۔ اس مواصلات کا طریقہ وہی ہوتا ہے جو ٹیلی فون اور ریڈیائی مواصلات کی صورت میں ہوتا ہے۔ فرق صرف ان ٹکنالوجیوں میں پایا

جاتا ہے جنہیں ان مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہزاروں میل کا فاصلہ نہ مواصلات کے معیار پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ ہی ماحولیاتی اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔

ابتداء ہی سے کیمرہ اور فلم کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو آسانی کے ساتھ اس بات پر یقین کر لے کہ آج ایسے کیمرے بھی دستیاب ہیں جن میں فلم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ تصویر کھینچنے کا کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ یہ نئے قسم کے کیمرے اور ان سے کی جانے والی تصویر کشی، ڈیجیٹل فوٹوگرافی کہلاتی ہے۔ روایتی کیمروں سے لی گئی تصویر Silver Halide کے چھوٹے چھوٹے نقاط پر مشتمل ہوتی ہے جو کسی شخصی منظر وغیرہ کا انالاگ نظام سے حاصل کیا گیا عکس ہوتا ہے۔ یہ نقاط لاکھوں اطلاعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر ہم تصویر کے اس عکس کو Digitized کر دیں تو نقاط کا مجموعہ مربع شکل کی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تبدیل ہو جائے گا جنہیں Pixels کہا جاتا ہے۔ Pixels ڈیجیٹل تصویر کے خلیے یا بنیادی عناصر ہوتے ہیں جو صفر اور ایک پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ڈیجیٹل فوٹوگرافی چار مدارج میں پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ کیمرے کو Click کر کے کمپیوٹر پر Download کیا جاتا ہے اور پھر اس کی ایڈیٹنگ عمل میں لا کر پرنٹ حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام امور آسانی کے ساتھ

منٹوں میں طے پاسکتے ہیں۔ تصویر میں جتنے زیادہ Pixels ریکارڈ ہوں گے وہ اتنی ہی صاف نظر آئے گی۔ تصویر کشی کے علاوہ ویڈیو گرافی کے لیے بھی ڈیجیٹل کیمرے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان تمام کیمروں میں فلم کی جگہ Charged Couple Devices ہوتے ہیں جو تصویر کے خیال یعنی عکس کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ ڈیجیٹل کیمرے انالاگ کیمروں کا بالکلیہ طور پر نعم البدل ثابت نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود ان میں خوبیاں ضرور ہوتی ہیں۔ ان سے لے گئی تصاویر کیمرے میں قید ہو جاتی ہیں اور وہ خراب نہیں ہو پاتیں۔ تصاویر کے حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی اطلاعات محفوظ رہتی ہیں۔ کھینچی گئی تصویر کو بہت ہی کم وقت میں حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔ علاوہ اس کے ایک آلہ Digital Modeler کی مدد سے کسی شئے کی 3D تصویر بڑی ہی آسانی کے ساتھ پردہ پر دکھائی جا سکتی ہے۔

آج کے اس دور میں تصویروں کی طرح آواز کی ڈیجیٹل ریکارڈنگ بھی عام ہوتی جا رہی ہے۔ انالاگ ساونڈ کو آسانی کے ساتھ Digitize کر کے دوسری اطلاعات کی طرح Disc پر محفوظ کر دیا جا سکتا ہے۔ آج مارکٹ میں کئی ایک قسم کے سافٹ ویر دستیاب ہیں جو آواز کی ڈیجیٹل ریکارڈنگ، ایڈیٹنگ اور اس کو دوبارہ سننے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آواز کی ڈیجیٹل ریکارڈ کے لیے Magnetic Storage

اور Optical Storage دو میڈیاں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کمپیوٹر پر اساس کرنے والے ڈیجیٹل آلات سے آواز کی Mixing، پراسسنگ، ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ کی جاتی ہے۔

آواز اور تصاویر کے لیے انالاگ ٹرانسمیشن کا شمار ایک بہت ہی طاقتور ذرائع ابلاغ میں ہوتا ہے۔ اگر اس کو ڈیجیٹل ٹرانسمشن میں تبدیل کر دیا جائے تو ٹی-وی کے لیے ان گنت چیانل کی ٹرانسمشن ممکن ہو سکے گی اور ساتھ ہی ساتھ کئی ایک نمایاں خصوصیات اور خدمات کا احیاء عمل میں آسکے گا۔ ٹی۔وی کے لئے ڈیجیٹل ٹرانسمیشن کی سہولت پہلے ہی سے یورپ، امریکہ، آفریقہ اور ایشیا کے کئی ایک قطعوں مین دستیاب ہے۔ جہاں تک ڈیجیٹل ویڈیو براڈ کاسٹنگ (DVB) کا تعلق ہے اس کو نہ صرف ٹی-وی سگنل کے لیے بلکہ ڈاٹا ٹرانسمیشن کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی جب کوئی کاپی حاصل کی جاتی ہے تو وہ (dub) نہیں کہلاتی بلکہ Clone کہلاتی ہے۔ کیوں کہ حاصل کردہ کاپی، اصل کاپی کی ہو بہو نقل ہوتی ہے اور ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کے معیار کو متاثر کیے بغیر لاتعداد کاپیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس ٹکنالوجی کے ذریعہ کم جگہ پر بہت زیادہ اطلاعات کی قابل بھروسہ ریکارڈنگ کم خرچ میں کی جا سکتی ہے۔ اس ریکارڈنگ کی بہترین مثال کمپاکٹ ڈسک

(CD) ہے۔ CD میں اطلاعات کو اسی طرح کوڈ کیا جاتا ہے جس طرح گرام فون ریکارڈ پر آواز کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ فرق اتنا ضرور رہتا ہے کہ ریکارڈ پر آواز کی لہریں اس کی سطح کے ساتھ افقی سمت کندہ کی ہوئی ہیں۔ جب کہ CD پر ریکارڈ شدہ ڈیجیٹل اطلاعات سطح سے عمودوار سمت میں ہوتی ہیں۔ ریکارڈ پر کندہ کی گئی آواز کی لہروں کو گرام فون میں ایک Stylus کے ذریعہ میکانی طور پر دوبارہ حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن سی ڈی کی صورت میں انہیں ایک لیزر بیم کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جہاں تک لانگ پلے اور آڈیو ٹیپ کا تعلق ہے ان پر ریکارڈ شدہ آواز انالاگ نظام کے تحت ہی ریکارڈ کی ہوئی ہوتی ہے۔

1995ء میں Industry Consortium نے ڈیجیٹل ویڈیو ڈسک (DVD) کو مارکٹ میں متعارف کروایا۔ آڈیو ریکارڈنگ کے لیے جہاں سی ڈی بہت کارآمد ذریعہ ہے وہیں ویڈیو ریکارڈنگ اور اس کے دوبارہ حصول کے لیے ڈی وی ڈی بہت کارآمد ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اطلاعات کو محفوظ کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دنیا کی پہلی بولتی فلم The Jazz Singer کی نمائش کے لیے 1928ء میں JamesBLensing نے سینما تھیٹروں کے لئے جس آڈیو سسٹم کو فروغ دیا تھا وہ JBL سسٹم کہلاتا ہے۔ آج کے سینما تھیٹروں میں JBL

سسٹم کو ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے لیس کر کے ان کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ان کا الحاق Dolby جیسے اداروں سے عمل میں لایا گیا جس کی بدولت یہ تھیٹر، ڈالبی تھیٹر کہلانے لگے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی پر مشتمل دنیا کی پہلی فلم The Lion King تھی جس کو ہالی ووڈ کی ڈزنی فلمز نے بنایا تھا۔

بڑے پیمانے پر اشاعتی اغراض کے لیے چاہے وہ کتابوں کے لیے ہو یا رسائل کے لیے آفسٹ پرنٹنگ کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ روایتی آفسٹ ٹکنالوجی کے استعمال میں پرنٹنگ سے پہلے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر ڈیجیٹل آفسٹ کلر پرنٹنگ تکنیک کو استعمال کیا جائے تو وقت اور کام دونوں ہی کی بچت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے Indigo Digital Offset Color Technology ایک ایسا ڈیجیٹل نظام ہے جس کے ذریعہ کسی بھی سطح جیسے کاغذ، فلم، کپڑا، پتر، پالی اتھیلن، دھاتی سطح اور یہاں تک کہ چینی مٹی (Ceramics) کی سطح پر بھی کلر پرنٹنگ بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔

1990ء کی آخری دہے میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی نے آرکیٹکچر کے میدان میں بھی اپنے قدم جما دیے جس کے نتیجہ میں ماہرین فن کو نت نئے ڈیزائن کی اختراع میں مدد ملی ہے۔ چنانچہ آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں اور بیراہاوز اور

امریکہ کے شہر Bilbao میں Guggenheim میوزیم عالم وجود میں آئے
جن کا شمار اس صدی میں بنائے گئے آرکیٹکچر کے شاہ کاروں میں ہوتا ہے۔ یہ
دونوں ہی عمارتیں اپنے اپنے شہروں کی شناخت کا درجہ رکھتی ہیں۔

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے انٹرنٹ اور e-Commerce پر
کریڈیٹ کارڈس کے چارجس کی وصولی کے لیے ڈیجیٹل ٹکنالوجی پر مشتمل دستخط کو
رواج دیا گیا ہے جو Digital Signature کہلاتی ہے۔ کسی شخص کے لیے
بھیجے گئے پیام کے وصول کا اختیار صرف اسی کے لیے ہوتا ہے۔ اس مقصد کی
براری میں یہ دستخط اہم رول انجام دیتا ہے۔

ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے اطلاق نے علم جغرافیہ کو ایک نئی جہت عطا کی
ہے اور یہ علم ڈیجیٹل جغرافیہ کہلانے لگا ہے۔ کمپیوٹر کی ماؤز کو ایک ہلکی سی جنبش
دے کر کسی بھی شہر، دیہات مقام یا ارضی قطعہ کے لیے دنیا بھر کی معلومات حاصل
کرلی جاسکتی ہیں۔ کسی بھی شہر میں پیش آنے والے جرائم سے لے کر ڈیپارٹمنٹل
اسٹورس کی تعداد تک کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی
دیگر سہولتوں میں قدرتی وسائل کا پتہ لگانا، کاشتکاری کے قابل ارضی قطعوں کی
جانکاری حاصل کرنا، ٹاون پلاننگ کو بروئے کار لانا، ماحولیاتی آلودگی کی
شناخت اور اس کے تدارک کا منصوبہ بنانا، آندھی طوفان کی پیش قیاسی کرنا
شامل ہیں۔

پروفیسر سید عبدالوہاب:

پروفیسر سید عبدالوہاب، جن کا قلمی نام ''وہاب قیصر'' ہے،
5 ستمبر 1949ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ نظام کالج (عثمانیہ یونی ورسٹی)
حیدرآباد سے بی۔ایس۔سی اور پھر وہیں سے طبعیات میں ایم۔ایس۔سی اور
پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی۔ 1973ء میں ممتاز کالج حیدرآباد میں طبعیات کے
لکچرر مقرر ہوئے۔ 1981ء میں صدر شعبۂ الکٹرانکس اور 1995ء سے وائس
پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی
حیدرآباد کے قائم مقام وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ فی الحال
ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم کے عہدے پر فائز ہیں۔

آپ زمانۂ طالب علمی ہی سے افسانے اور مضامین لکھ رہے ہیں۔
ابتداء میں چند افسانے ''ماہنامہ پیکر''، واقعات (ڈائجسٹ) اور روزنامہ
''رہنمائے دکن'' میں شائع ہوئے۔

پروفیسر وہاب قیصر 1971ء سے سائنسی مضامین لکھ رہے ہیں۔ آپ
کے سائنسی مضامین آسان و عام فہم اردو میں ادبی چاشنی کے حامل ہوتے ہیں۔

غالبؔ کے اشعار کی سائنسی تشریح کے علاوہ آپ کے مضامین کا
مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

معنی اور اشارے:

متضاد	:	برعکس - الٹا - ایک دوسرے کی ضد - الگ الگ
مترادف	:	ہم معنی، دو ایسے الفاظ جن کے معنی ایک ہوں۔
مربوط	:	ربط کیا ہوا - جڑا ہوا - جسے جوڑا گیا ہو۔
توقف	:	وقفہ - دیر - ڈھیل
مواصلات	:	ذرائع حمل و نقل - جوڑنے کے ذرائع (Communication)
کثیف	:	دبیز - گاڑھا - گنجلک - (Polluted)
وقوع پذیر	:	واقع ہونا - ظاہر ہونا
مدارج	:	درجے - رُتبے
اُفقی سمت	:	اوپر کی جانب - اوپر کی طرف
کندہ	:	کُھدا ہوا - نقش کیا ہوا - مُنقّش
عمود وار سمت	:	سیدھی جانب - خط مستقیم کی طرف
الحاق	:	شامل ہونا - داخل ہونا - ملنا
شناخت	:	پہچان - تمیز - واقفیت

مقصد براری	:	مقصد پورا ہونا - مراد پوری ہونا - مطلب حاصل ہونا
جہت	:	سمت - جانب - طرف - راستہ
تدارک	:	روک تھام - انسداد - کنٹرول
پیش قیاسی	:	پیشین گوئی

زبان و بیان:

جب سے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے الکٹرانک مشینوں کا چلن عام ہوا تو اسی کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا بھی آغاز ہوا۔ ڈیجٹ ہندسے کو کہتے ہیں۔ اور اس ٹکنالوجی میں مثبت (1) اور منفی (0) کے ان دو متضاد اعداد سے حاصل ٹکنالوجی سے تمام امور مشین کے ذریعہ انجام دئے جاتے ہیں۔

ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، وہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا دور ہے۔ تقریباً تمام ہی کام ہم ڈیجیٹل اشیاء سے لے رہے ہیں۔

مواصلات (Communications) کا سارا نظام ڈیجیٹل ٹکنالوجی ہی پر کام کرتا ہے۔ جیسے ٹیلی فون، فیاکس، ای میل، انٹرنیٹ وغیرہ۔

ڈیجیٹل ریکارڈنگ کے ذریعہ (سمعی و بصری) آڈیو اور ویڈیو اور

فوٹوگرافی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

غرض ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے ذریعہ دنیا بھر کی معلومات حسب ضرورت مختصر سے عرصے میں حاصل ہوتی ہیں۔

مضمون خالص معلوماتی اور سائنسی ہونے کے باوجود آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے جو پروفیسر وہاب قیصر کا کمال ہے۔

غور و فکر:

I مندرجہ ذیل جملوں کو موزوں الفاظ سے مکمل کیجئے:

1- انسانی عوامل کی طرح ''ایک'' اور ''صفر'' دو.................اعداد ہیں۔

2- ہاں اور نہ On اور Off کے.................ہوتے ہیں۔

3- ڈیجیٹل نظام کے تحت طے پانے والے امور.................کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

4- ابتداء ہی سے کیمرہ اور فلم کا.................کا ساتھ رہا ہے۔

5- ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی کاپی کو dub نہیں بلکہ.................کہا جاتا ہے۔

II مندرجہ ذیل حصہ الف اور حصہ ب میں جوڑ لگایئے:

1- مشینوں کے ذریعہ طے پانے والے مختلف امور - پر Download کیا جاتا ہے

2- میکانی گھڑی انالاگ نظام کی - افقی سمت کندہ کی ہوئی ہوتی ہیں
3- ابتداہی سے کیمرہ اور فلم کا - دونظاموں پر عمل پیرا ہوتے ہیں
4- کیمرے کو click کر کے کمپوٹر - ایک اچھی مثال ہے
5- ریکارڈ پر آواز کی لہریں اسکی سطح - چولی دامن کا ساتھ ہے
کے ساتھ

III مختصر سوالات:

1- ڈیجیٹل الکٹرانکس کی زبان میں ایک اور صفر کے معنی کیا ہیں؟
2- ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے مواصلات کے کونسے ذرائع کام کرتے ہیں؟
3- ڈیجیٹل فوٹوگرافی کتنے مرحلوں میں مکمل ہوتی ہے؟
4- ڈیجیٹل ویڈیوڈسک (DVD) کو کب متعارف کرایا گیا؟
5- دنیا کے دو بڑے میوزیم کہاں کہاں بنائے گئے؟

IV توضیحی سوالات:

1- صفر اور ایک کے نظام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2- ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا استعمال کن کن چیزوں میں ہورہا ہے؟
3- ڈیجیٹل مواصلات کی کیا خصوصیات ہیں؟
4- ڈیجیٹل ریکارڈنگ کی کیا اہمیت ہے؟
5- فن تعمیر (آرکیٹکچر) کے میدان میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے کیا فائدہ ہوا؟

V تفصیلی سوالات:

1- ڈیجیٹل ٹکنالوجی کیا ہے؟

2- بغیر فلم کے کیمرہ سے ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی مدد سے تصاویر کیسے لی جاتی ہیں؟

3- سی ڈی اور ڈی وی ڈی کس طرح کام کرتے ہیں؟

4- کتابوں اور رسالوں کی پرنٹنگ میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا کیسے استعمال ہوتا ہے؟

5- ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے ذریعہ علم جغرافیہ میں کیا وسعت پیدا ہوئی؟

سائنس اور ہمارا معاشرہ

مرتب: سید محمد اسمٰعیل

سوئٹزرلینڈ کے سائنس دانوں کو ایلپس پہاڑ کی ایک چوٹی پر برف میں دبی ایک انسان کی لاش ملی۔ برف میں چونکہ ہر شے کو محفوظ رکھنے کی خاصیت ہوتی ہے اس لیے یہ لاش بالکل صحیح سلامت ملی تھی۔ اس کے جسم پر کھالوں سے بنا لباس بھی تھا اور اس کے ساتھ ایک تھیلا بھی پایا گیا تھا جس میں دواؤں اور خوراک کی قسم کی کچھ چیزیں تھیں۔ اس لاش کو صحیح حالت میں دیکھ کر سب سے پہلے سائنس دانوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کتنی پرانی ہے۔ اس سے پہلے مصر میں بادشاہوں اور شہزادیوں کی لاشوں کو ممی بنا کر مقبروں میں دفن کرنے کا رواج تھا۔ ممی بنانے کے لیے اس وقت کے سائنس داں، جو ''کاہن'' کہلاتے تھے، لاش پر ایسے کیمیاوی اجزا لگاتے تھے جس سے لاش سڑتی یا گلتی نہیں تھی۔ آج کل یہ ممیاں دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں اور اندازے کے مطابق یہ ممیاں تین سے پانچ ہزار سال تک پرانی ہیں۔ لیکن ایلپس کی پہاڑی پر جو لاش ملی اس کو ممی نہیں بنایا گیا تھا۔ خیال یہ ہے کہ وہ کوئی مسافر تھا اور پہاڑ پر سفر کرتے ہوئے کسی وجہ سے مر گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد لاش برف میں دبتی چلی گئی اور ''ممی'' کی طرح محفوظ ہوگئی۔

آج کل کسی بھی شئے کی عمر معلوم کرنے کے لیے سائنس داں ''کاربن ڈیٹنگ'' (Carbon Dating) کا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک سائنسی طریقہ ہے جس کے ذریعے دریافت کی گئی عمر پچانوے فی صد تک درست ہوتی ہے۔ سائنس دانوں نے جب اس مردہ انسان پر یہ طریقہ استعمال کیا تو پتہ چلا کہ وہ پانچ ہزار سال پہلے مرا تھا۔ اس لاش پر تجربات جاری ہیں۔ اب تک اس لاش سے یہ پتہ چل چکا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے کا انسان اپنے کچھ امراض کے لیے جڑی بوٹیاں استعمال کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ تیر، کمان اور ایک نیزہ بھی تھا۔

یہ واقعہ بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ یہ تو صرف پانچ ہزار سال پہلے کے انسان کی بود و باش اور رہن سہن پر ذرا سی روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن اگر آپ فاصلوں کی طرح وقت میں سفر کرتے ہوئے بیس تیس ہزار سال پیچھے جاسکیں تو دیکھیں گے کہ اس دور کے انسان گھر بنانا بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے غاروں میں رہتے تھے۔ کھانے کے لیے پھل اور جانوروں کا گوشت استعمال کرتے تھے۔ انھی جانوروں کی کھالوں سے جسم ڈھانپنے کا کام لیتے تھے۔ مچھلی کے کانٹوں سے اور جانوروں کے جسموں سے نکالے گئے ریشوں سے دھاگوں کا کام لیتے تھے۔ آگ جلانا آگیا تھا۔ اس لئے سردی سے بچنے کے لئے اور گوشت کو بھوننے کے لیے آگ استعمال کرنے لگے تھے۔ جانوروں کا شکار کرنے

کے لیے پتھر کے ہتھیار بنانا سیکھ گئے تھے۔ درختوں کی مضبوط شاخوں سے لاٹھیاں بنانے لگے تھے۔ پھر کچھ وقت گزرنے پر ان کو تانبا دھات مل گئی۔ اس طرح وہ بہتر زندگی کے لیے تانبے سے ہتھیار اور شاید برتنوں کی قسم کی کچھ چیزیں بنانے لگے۔ اسی زمانے کے کسی ذہین انسان نے عقل سے کام لے کر پہیّہ بنایا جس سے ان کو بھاری چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی سہولت ہوگئی۔

سائنس داں عام طور پر یہ مانتے ہیں کہ پہلا سائنس داں وہی شخص تھا جس نے پہیّہ ایجاد کیا تھا کیوں کہ پہیّے کی ایجاد کے بعد ہی معاشرے میں صحیح معنوں میں ارتقا شروع ہوا۔ آج آپ جانتے ہیں کہ ریل گاڑیاں، موٹریں ہر قسم کی مشینیں حتیٰ کہ ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں میں بھی کسی نہ کسی مقصد کے لیے پہیّے استعمال ہوتے ہیں۔ اگر پہیّہ ایجاد نہ ہوتا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان ارتقا کی اس منزل تک نہ پہنچ پاتا جہاں آج ہے۔

پہیّے کی ایجاد سائنس کی ابتدا تھی۔ پھر سوچنے والے انسانوں نے زندگی کی دوسری ضرورتوں اور سہولتوں کی بارے میں سوچنا شروع کیا۔ مثلاً روشنی کے لیے انھوں نے چربی جلانی شروع کردی۔ جسم کی بیماریوں کے لیے مختلف قسم کے پودوں اور پھلوں کا استعمال کرنے لگے۔ زہریلے اور خطرناک جانوروں سے بچنے کے طریقے دریافت کرنے لگے۔ کھیتی باڑی کرنا سیکھ لیا لیکن ان تمام کاموں کے لیے انسانی دماغ اور انسانی جسم کی طاقت ہی ان کے پاس

تھی۔ آج کے دور کی سی سہولتیں میسّر نہ تھیں، نہ تفریح کے سامان تھے۔ اس زمانے کی زندگی بہت سخت تھی۔ دھیرے دھیرے انسانی دماغ میں سوچنے کی قوت بڑھتی گئی۔ فطرت کی بہت سی چیزوں کے مشاہدات اور تجربات سے وہ بہتر زندگی گزارنے کا بہتر سلیقہ سیکھتے گئے۔

اسی غور و فکر اور مشاہدات و تجربات کے نچوڑ کا نام سائنس پڑا۔ یعنی جوں جوں دوسری چیزوں کے بارے میں ان کا علم بڑھتا گیا۔ سائنس ترقی کرتی گئی۔ ہر نسل اپنے تجربات اور علم نئی نسل کو دیتی گئی اور نئی نسلیں ان علوم میں اضافہ کر کے سائنس کو آگے بڑھاتے ہوئے آج کی منزل تک پہنچ گئیں۔

چار پانچ سو سال پہلے لندن میں طاعون پھیلا تھا جس سے لندن کی آدھی آبادی ختم ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں بھی ساٹھ ستّر سال پہلے تک طاعون، ہیضہ اور چیچک جیسی بیماریاں تباہی پھیلاتی رہتی تھیں۔ سو سال پہلے تک لوگ ان بیماریوں کو خدا کا عذاب سمجھتے تھے۔ انھیں علم نہیں تھا جراثیم اور وائرس کیا ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ تباہ کن بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ وہ تو جب خُردبین ایجاد ہوئی اور اس خردبین کے نیچے صاف پانی کے ایک قطرے کو رکھ کر دیکھا گیا تو اس زمانے کے سائنس داں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس صاف پانی میں بہت سی عجیب جاندار اشیا تیرتی پھر رہی ہیں۔ بعد میں سائنس دانوں نے ان کو جراثیم اور وائرس کا نام دیا اور ان کے بارے میں کھوج شروع کی۔ اس طرح پہلی بار

پتہ چلا کہ مہلک بیماریاں یہ ننھے ننھے جاندار پھیلاتے ہیں جنھیں خردبین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔

جراثیم کی دریافت سے پہلے کسی مریض کا آپریشن کرنا ایک طرح سے موت کو دعوت دینا ہوتا تھا۔ کیوں کہ پرانے زمانے کے ڈاکٹروں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ زخموں کو خراب ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ عام طور پر زخموں میں سیپٹک یعنی زہرباد پھیل جاتا اور مریض مر جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دو تین سو سال پہلے ڈاکٹروں کا آپریشن تھیٹر کسی مذبح سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بے ہوش کر دینے والی یا جسم کو سن کر دینے والی دوائیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے بہت مجبوری کے عالم میں ڈاکٹر کسی مریض کا زخمی ہاتھ یا پاؤں کاٹتے تھے یا کوئی اور بڑا آپریشن کرتے تھے۔ اس قسم کے آپریشن کے وقت مریض کو ایک میز پر لٹا کر چمڑے کی مضبوط پٹیوں سے باندھ دیا جاتا تھا اور چار پانچ قوی ہیکل شخص اس کو دبائے رکھتے۔ ڈاکٹر آپریشن کرتا تھا تو مریض کی چیخیں دور دور تک سنائی دیتیں۔ یہ سائنس کی ہی دین ہے کہ آج بڑے سے بڑا آپریشن ہو جاتا ہے اور مریض کو تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا اور اینٹی سیپٹک دواؤں کی وجہ سے اب آپریشن کے زخم بغیر کسی دشواری کے بھر جاتے ہیں۔

سائنس دانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں کمالات کر دکھائے ہیں۔ آج کی زندگی کی تمام سہولیات اور تمام عیش و آرام علم سائنس اور سائنس دانوں

کی وجہ سے انسان کو حاصل ہیں۔ مثلاً دو سو سال پہلے ایک شخص نے چائے بناتے ہوئے دیکھا کہ گرم پانی سے بھاپ اٹھ رہی ہے اور وہ بھاپ کیتلی کے ڈھکن کو بار بار اٹھا رہی ہے۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر بھاپ میں اتنی قوت ہے کہ وہ کیتلی کے ڈھکن کو بار بار اٹھا دیتی ہے تو اس قوت سے کوئی اور کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے بھاپ کی قوت استعمال کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اور بھی کچھ سائنس داں بھاپ سے کام لینے کے طریقے ڈھونڈنے لگے۔ نتیجے میں اسٹیم سے چلنے والا ریل کا انجن وجود مین آ گیا جس نے دنوں کے سفر کو گھنٹوں میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ ریل کے انجن کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ انگلینڈ میں جب پہلی بار بھاپ سے چلنے والا انجن رات کے وقت ایک گاؤں کے قریب سے گزرا تو اس گاؤں کے لوگ ڈر کر اپنی بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انجن سے دھواں اور چنگاریاں نکل رہی تھیں اس لیے انھوں نے سوچا کہ کوئی بھوت آ گیا جو آگ اور دھواں اُگل رہا ہے۔

ریلوے انجن کی ایجاد کے بعد جلد ساری دنیا میں ریلوں کا جال پھیل گیا۔ پھر بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بننے لگے جن کو دُخانی جہاز بھی کہا جاتا تھا۔

انجن کی ایجاد کے بعد سائنس داں پٹرول سے چلنے والے کاروں کے انجن بنانے پر لگ گئے۔ آخر انیسویں صدی میں کاریں شہروں کی سڑکوں پر

دوڑنے لگیں۔ پہلے سفر کے لیے گھوڑے، اونٹ، بیل گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں یا لوگ پیدل سفر کرتے تھے اور سو میل کا فاصلہ طے کرنے میں بھی کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ریلوے کے انجنوں اور موٹروں کی ایجاد سے سفر آرام دہ اور آسان ہو گئے اور بہت کم وقت لینے لگے۔ اس کے بعد 1903ء کے لگ بھگ فرانس کے رائٹ برادرز نے پہلا ہوائی جہاز بنایا اور انسان کو قوت پرواز دے دی۔ آج آپ رائٹ برادرز کے سائنسی تجربات کے باعث چند گھنٹوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ اُڑ کر طے کر لیتے ہیں۔

اس دوران کچھ سائنس داں بجلی پر تجربات کر رہے تھے۔ یوں تو بجلی سے لوگ بہت پہلے واقف ہو چکے تھے مگر وہ صرف ساکن بجلی (Static Electricity) سے واقف تھے۔ اس بجلی سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہ بجلی کہربا کو ریشم پر رگڑ کر پیدا کی جا سکتی تھی جو صرف شرارے کی صورت میں نظر آ جاتی تھی۔ 1753ء میں بنجامن فرینکلن نام کے سائنس داں نے نیگیٹو (Negative) اور پوزیٹو (Positive) برقی کرنٹ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ چیزوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی بجلی اور آسمانی بجلی ایک ہی خاصیّت کی ہوتی ہیں۔ پھر بنجامن کے نظریے کو بنیاد بنا کر بہت سے سائنس دانوں نے بجلی کو سمجھنے اور اس سے کام لینے کے لیے تجربات شروع کیے۔ آخر 1831ء میں مائیکل فیراڈے نام کا سائنس ڈاں بجلی پیدا کرنے والا پہلا جنریٹر

بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ نتیجے میں ایڈیسن نے بجلی سے جلنے والا پہلا بلب بنا کر ساری دنیا کو روشن کر دیا۔ شروع کی موٹروں میں روشنی کے لیے مٹّی کے تیل سے جلنے والے لیمپ لگائے جاتے تھے۔ بجلی کے بلب ایجاد ہونے کے بعد براہ راست بجلی یا بیٹری (Battery) کے ذریعے ہر جگہ روشنی پہنچ گئی اور یہی نہیں آج کے ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر وغیرہ سب بجلی سے ہی کام کرتے ہیں۔ اگر بجلی ایجاد نہ ہوئی ہوتی تو آپ کے گھر میں نہ ٹیلی ویژن ہوتا نہ ریڈیو نہ بجلی سے جلنے والے پنکھے اور نہ ہی چیزوں کو ٹھنڈا رکھنے والے ریفریجریٹر۔ آج کے دور میں لیزر کرنوں سے بہت سے امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بجلی کی ایجاد کے باعث ہی ممکن ہو سکا ہے۔

گراہم بیل نام کے سائنس داں نے ٹیلی فون بنایا جس پر آج آپ گھر بیٹھے دنیا کے کسی شہر میں بھی اپنے رشتہ داروں یا دوستوں سے باتیں کر سکتے ہیں۔ گھر میں بجلی کی استری اور بجلی کے چولھوں نے خواتین کی بہت سی مشکلیں حل کر دی ہیں۔ ایک سائنس داں نے کپڑے سینے کی مشین بنائی جس کی مدد سے سئے گئے طرح طرح کے فیشنوں کے کپڑے آج لوگ پہنے پھرتے ہیں۔ اسی مشین میں بجلی کا موٹر لگا دیا گیا تو مشین گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرنے لگی۔ غرض یہ کہ سائنس نے ہمارے لیے آج اتنی آسائشیں مہیا کر دی ہیں کہ پہلے کے انسان ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہاں ایک لطیفہ نما واقعہ سنانا دل چسپ ہوگا۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ایجادات کو پیٹنٹ رجسٹر کرنے کے سرکاری دفتر کے ڈائرکٹر نے یہ لکھ کر اپنا استعفیٰ گورنمنٹ کو دے دیا کہ ''جتنی ایجادات ممکن تھیں وہ سب ہو چکی ہیں اور اب مزید ایجادات ہونا ممکن نہیں اس لیے میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہوں''۔ لیکن ہوا یہ کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک جتنی ایجادات ہو چکی تھیں بیسویں صدی کی ایجادات کے سامنے عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس صدی میں ہونے والی ایجادات کی بنیادیں سینکڑوں اور ہزاروں سال پہلے کے سائنس داں رکھ چکے تھے۔ مثلاً ''ایٹم'' کا تصور دو ہزار سال پہلے سائنس داں دیما قریطس نے پیش کیا تھا۔ فلکیات میں کوپرنیکس اور گلیلیو کی دریافتوں کی بدولت ہی آج ہم اپنے نظام شمسی کو سمجھنے کے قابل ہو سکے ہیں۔ لیونارڈو ڈاونچی دنیا کا عظیم ترین مصور مانا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہترین سائنس داں بھی تھا۔ پرندوں کی طرح اُڑنے کا تصور سب سے پہلے اس کے ذہن میں آیا تھا اور اس نے کسی ہلکی چیز سے بنے ایسے پروں کے نقشے بنائے تھے جن کے ذریعے انسان ہوا میں اُڑ سکتا تھا۔ اسی کے نظریے نے رائٹ برادرز کو ہوائی جہاز بنانے کی راہ دکھائی۔

لیونارڈو پہلا شخص تھا جس نے بہتے پانی سے کام لے کر پن چکی بنائی۔ اس نے آب دوز کشتی اور جنگی ٹینک بنانے کے نقشے بھی تیار کیے تھے مگر

اس نے یہ نقشے اس وقت کے بادشاہ کو اس لیے نہ دیے کہ وہ ان ہتھیاروں سے غلط کام لے کر بے گناہ انسانوں کو تباہ کر سکتا تھا۔

آئزک نیوٹن نے کشش ثقل (Gravity) کا تصور دیا۔ یعنی اس کائنات میں ہر مادی پیکر قوتِ کشش سے دوسری چیزوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جتنا بڑا جسم ہوگا اتنی ہی قوتِ کشش زیادہ ہوگی۔ جس طرح ہماری زمین کی کشش ثقل چاند کی قوتِ کشش سے چھ گنا زیادہ ہے۔ یعنی زمین پر کسی چیز کا وزن اگر چھ کلو ہے تو چاند پر وہ صرف ایک کلو رہ جائے گا۔ اسی طرح وہی چھ کلو وزن سیارہ جیوپیٹر (مشتری) پر کئی گنا بڑھ جائے گا کیوں کہ جیوپیٹر ہمارے نظام شمسی میں سب سے بڑا سیارہ ہے۔

کیمسٹری کے میدان میں بھی جراثیم کی دریافت کے بعد تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ پہلے اینٹی سیپٹک دوائیں بنیں جن سے زخم جلد اچھے ہونے لگے۔ پھر کلوروفارم پر تجربات کر کے اس کو آپریشن کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی کلوروفارم سنگھا کر مریض کو بے ہوش کر دیا جاتا تھا اور اس بے ہوشی میں مریض کو تکلیف کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ آج کل آپریشن کے لیے بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم کا استعمال بند ہو گیا ہے اور دوسرے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ درد کو فوراً دور کرنے کی طرح طرح کی دوائیں سائنس دانوں نے ایجاد کر لی ہیں۔

مختصر یہ کہ آج کی آرام دہ زندگی ان تمام سائنس دانوں کی مرہونِ منّت ہے جو ہزاروں سال سے مختلف اشیا پر اور شعبوں میں تجربات کرتے رہے ہیں۔ یہ وہ سائنس داں ہیں جنھوں نے انسان کی بہتری کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔

سائنس کا یہ ارتقا ابھی رُکا نہیں ہے۔ نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ جینیٹک سائنس نے تو سائنس دانوں کے سامنے ایک نئی اور پُراسرار دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مستقبل میں سائنس کیسے کیسے کرشمے دکھا سکے گی، ابھی ہم ان کو صرف خواب کہہ سکتے ہیں لیکن جو حقیقتوں کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں۔ اسی طرح فلکیات کی سائنس مستقبل میں کیا کمالات دکھائے گی اس کے بارے میں بھی صرف اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں پہلے کوئی خلا میں جانے کے بارے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چاند کو یا تو دیوتا مانا جاتا تھا یا شاعر اپنے محبوب کے چہرے سے تشبیہہ دیتے تھے۔ آج انسان چاند کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے۔ وہاں کی مٹی زمین پر لا چکا ہے۔ نظام شمسی کے کئی سیاروں پر اپنے سیٹیلائٹ اُتار چکا ہے۔ ''میر'' نام کا ایک خلائی اسٹیشن اٹھارہ سال خلا میں رہ کر خلائی سائنس دانوں کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ اب دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں مل کر خلا میں ایک پلیٹ فارم بنا رہی ہیں۔ یہ خلا بازوں کی ایک چھوٹی سی بستی بن جائے گا۔ پھر اس پلیٹ فارم سے دوسرے سیاروں تک خلائی جہاز بھیجنا بہت آسان ہو جائے گا۔ کیوں کہ زمین سے کسی راکٹ کو خلا میں بھیجنے کے لیے بے شمار روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

زمین کی کشش اس قدر طاقت ور ہے کہ خلائی راکٹ ایک سیکنڈ میں سات میل کی رفتار سے اگر نہ اُڑ سکے تو کشش ثقل اس کو واپس کھینچ لیتی ہے۔ یہ رفتار حاصل کرنے کے لیے بے حد ایندھن، دوسرے معنوں میں بے شمار روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ خلا سے کسی سیارے پر راکٹ بھیجنے کے لیے ایندھن کا یہ سارا خرچ بچ جائے گا۔ یہ روپیہ خلا میں انسانی زندگیاں برقرار رکھنے کے کام آسکے گا۔

آج ہم سائنسی ارتقا کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں کہ جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حال ہی میں ایک مرتے ہوئے مریض کے سینے میں چھوٹا سا مصنوعی یعنی میکینکل دل لگا کر اس کی زندگی بچائی گئی ہے۔ مستقبل میں یہ ممکن ہے کہ بایونکس سائنس کی مدد سے انسانی جسم کا ہر عضو قدرتی عضو کی طرح بنایا جانے لگے۔ اگر کبھی ایسا ممکن ہو گیا تو کہا جاسکتا ہے کہ انسان موت پر قابو پالے گا۔ ویسے یہ بات بہت پہلے ایک روسی سائنس داں کہہ گیا ہے کہ مستقبل میں موت صرف ایک بیماری کہی جاسکے گی جس کا علاج ممکن ہوگا۔

سید محمد اسمٰعیل

سید محمد اسمٰعیل مدراس کے ایک علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر الحاج میر طفیل احمد صاحب مرحوم اپنے وقت کے بڑے طبیب تھے۔ علم و ادب سے گہری وابستگی تھی۔ اردو زبان و ادب کی

ترویج اور قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئے تھے۔

سید محمد اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم مسلم ہائی سکول میں ہوئی۔ میسور یونیورسٹی سے ایم-اے کیا۔ 1967ء میں بحیثیت اردو منشی آپ کا تقرر ہوا۔ 1970ء میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر 1990ء میں وائس پرنسپل ہو کر گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ آئے اور ہنوز اس عہدے پر فائز ہیں، وزارت تعلیم، حکومت ہند کی طرف سے آپ کو ایک سال کے لئے ''ڈپلوما اِن کشمیری لینگویج'' کی تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ آپ این-سی-آر-ٹی اور ٹمل ناڈو کی نصابی کمیٹیوں کے رکن بھی ہیں۔ آپ کی زیر نگرانی سائنس اور سماجی سائنس کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔

معنی اور اشارے:

خوراک : کھانے کی چیز - غذا - راشن

نمائش : دکھاوا

بود و باش : رہن سہن

مشاہدات : مشاہدہ کی جمع - دیکھنا - معائنہ

پہیّہ : چکّر - حلقہ - گاڑی کا وہ حصہ جو زمین پر چلتا ہے۔

ارتقاء : ترقی

طاعون	:	ایک مہلک اور متعدی وباء - پلیگ
ہیضہ	:	ایک مہلک اور متعدی بیماری
مذبح	:	ذبح کرنے کی جگہ
قوی ہیکل	:	طاقت ور جسم والا
آب دوز	:	وہ جنگی کشتی جو پانی کے نیچے بھی چل سکتی ہے اور اوپر بھی۔
کہرباء	:	ایک قسم کا زرد گوند
مہلک	:	ہلاک کرنے والا یا والی
آسائش	:	راحت - آرام - سہولت
عشر عشیر	:	دسویں کا دسواں حصہ $\frac{(1/10)}{10}$ $(^1/_{100})$ بہت تھوڑا سا۔
مرہونِ منت	:	احسان مند - شکر گذار - ممنون
حجم	:	جسامت - موٹائی

زبان و بیان

''سائنس اور ہمارا معاشرہ'' ایک ایسا تحقیقی مضمون ہے جس میں سائنس کی تحقیقات اور ایجادات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ زمانۂ قدیم سے آج تک سائنس نے جتنی ترقی کی ہے اس کا سلسلہ وار تجزیہ کیا گیا ہے۔

نیز اس بات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے کہ سائنس دانوں نے سہولتوں اور آسائشوں کے حصول کے لئے کس کس طرح انتھک جد و جہد کے ذریعہ ایجادات کو بطور سوغات پیش کیا جن سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

مضمون میں پانچ ہزار سال پہلے کے کاہنوں کی ممّیوں سے سائنس کا آغاز کیا گیا ہے۔ پہیّے کی ایجاد کو سائنس کی ابتداء قرار دیا گیا ہے۔ جراثیم کی کھوج۔ آپریشن کے جدید طریقوں اور ریل اور ہوائی جہاز کی ایجاد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بجلی کی ایجاد اور فون کی ایجاد کا بھی تاریخ وار احاطہ کیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ جینِٹک سائنس اور بایونکس سائنس تک کا تفصیلی اور معلوماتی تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس معلوماتی مضمون کو غور سے پڑھیے اور اس میں مذکور سائنس دانوں، مہلک بیماریوں اور جراثیم کے نام ذہن نشیں کیجیے۔

غور و فکر

I مندرجۂ ذیل سوالوں کا جواب دیجیے:

1- ممّی کسے کہتے ہیں؟

2- انسان کی پہلی ایجاد کیا تھی؟

3- قدیم زمانے کے سائنس دانوں کو کیا کہتے تھے؟

II مندرجۂ ذیل حصۂ الف اور حصۂ ب میں جوڑ لگائیے:

	حصۂ (الف)		حصۂ (ب)
(1	آج کل کسی بھی شے کی عمر معلوم کرنے کے لئے سائنس داں	-	کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔
(2	پہلا سائنس داں وہی شخص تھا	-	اور اب مزید ایجادات ہونا ممکن نہیں
(3	نتیجہ میں اسٹیم سے چلنے والا	-	جس نے پہیہ ایجاد کیا تھا
(4	جتنی ایجادات ممکن تھیں وہ سب ہو چکی ہیں	-	کاربن ڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کرتے ہیں
(5	آج ہم سائنسی ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں	-	ریل کا انجن وجود میں آ گیا

III مختصر سوالات:

1- سوئزرلینڈ کی پہاڑی پر سائنسدانوں کو کیا کیا ملا؟
2- ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی لاش خراب کیوں نہیں ہوتی؟
3- کاربن ڈیٹنگ سے کیا معلوم کرتے ہیں؟
4- پہیہ کی ایجاد سے کیا کیا فائدے حاصل ہوئے؟
5- ہوائی جہاز کس نے اور کب بنایا؟

6- ٹیلی فون کس نے ایجاد کیا؟

7- سائنس کی ترقی نے آپریشن کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں؟

IV توضیحی سوالات:

1- خوردبین کی ایجاد سے کیا فائدہ ہوا؟

2- زمانۂ قدیم میں آپریشن کس طرح ہوتا تھا؟

3- بھاپ کی قوت کا پتا کیسے لگا؟

4- ہوائی جہاز کی ایجاد کب ہوئی اور کس نے کی؟

5- بجلی کس نے ایجاد کی؟

V تفصیلی سوالات:

1- امریکہ کے ایجادات کے ڈائرکٹر نے استعفیٰ کیوں دیا؟

2- بیس تیس ہزار سال پہلے کے انسان نے رفتہ رفتہ کیسے ترقی کی؟

3- کمیسٹری کے میدان میں جراثیم کی دریافت سے کیا فائدے ہوئے؟

4- مندرجۂ ذیل جملوں کی بحوالۂ متن تشریح کیجئے:

(الف) ''سائنسدانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں کمالات کر دکھائے ہیں''۔

(ب) ''سائنس کا یہ ارتقاء ابھی رکا نہیں ہے۔''

(ج) ''آج ہم سائنسی ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

مرتب: ڈاکٹر محمد عبید الرحمن

مذہب اسلام میں کسی بھی خاتون کو وہ رتبہ وہ شرف حاصل نہیں جو حضرت سیدہ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کو نصیب ہوا۔ وہ اس لئے کہ کفر و باطل کے گھنے بادلوں کو کاٹ کر جب آفتاب رسالت طلوع ہوا تو اس کی پہلی کرن نے انہیں کے سینہ کو منور کیا۔ تاریخ اسلام میں اولین مومن ہستی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی ذات اقدس تھی۔ آپ سرورِ کائنات رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف رفیقۂ حیات ہی نہ تھیں بلکہ ایسی حق شناس کہ ان کے ضمیر نے فوراً تصدیق کر دی کہ حضورؐ کو غار حرا میں رب العزت نے رسالت کا تاج بخش دیا۔ خوف و ہراس کے موقع پر تسکین دینے والی، قبول اسلام میں سبقت کرنے والی، آل رسول کا سلسلہ قائم کرنی والی، حضورؐ پر سب کچھ قربان کرنے والی، مرتے دم تک حضورؐ کا ہاتھ بٹانے والی، رسالت کی بشارت دینے والی حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہی تھیں۔ آپ ہی نے حضورؐ کی معاشی مشکلات کو دور کیا۔ آپ ہی نے حضور کو عبادت و ریاضت، کی ساری سہولتیں فراہم کیں۔ آپ ہی نے غار حرا جیسی دشوار گذار پہاڑی تک چڑھ کر مہینوں حضورؐ کی خدمت میں طعام پیش کرتی رہیں۔ سب سے بڑھ کر مخالفت کا جب طوفان اٹھا تو آپ ہی نے ہر قسم کے روح فرسا، خوں افشاں

مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ حضورؐ کی رفاقت و جاں نثاری کا حق ادا کردیا۔ آزمائش و امتحان کے سخت ترین مرحلوں کے دور میں تبلیغ حق کی راہ میں ہمت و استقلال کی چٹان کی طرح کھڑی ہوگئیں۔

آپ کا رتبہ اس بات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے حسب معمولی خدیجۃ الکبریٰ کی تعریف کرنی شروع کی۔ مجھے رشک آیا۔ میں نے کہا ''یارسول اللہ ﷺ وہ ایک بڑھیا بیوہ عورت تھیں۔ خدا نے ان کے بعد آپ کو ان سے بہتر بیوی عنایت کی''۔ یہ سن کر حضورؐ کا چہرہ مبارک غصّہ سے سرخ ہوگیا اور فرمایا ''خدا کی قسم مجھے خدیجہ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھٹلایا۔ اس نے اپنا زر و مال مجھ پر قربان کردیا۔ جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے اس کے بطن سے مجھے اولاد دی''۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''میں ڈر گئی اس روز سے عہد کرلیا کہ آئندہ حضورؐ کے سامنے کبھی خدیجۃ الکبریٰ کے متعلق کچھ نہ کہوں گی''۔

آپ کے والد کا نام خویلد بن اسد تھا۔ ان کے پڑ دادا عبدالعزیٰ قصی حضور کے جد امجد تھے۔ آپ کی ماں کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ آپ کا نام خدیجہ، اور لقب طاہرہ تھا۔ ''طاہرہ'' کا لقب آپ کے اوصاف جمیلہ کی دلالت کرتا تھا جیسا کہ حضورؐ کا لقب ''امین'' آپ کی سیرۃ مطہرہ کا مظہر تھا۔ یہ

قدرت کا منشا تھا کہ ''طاہرہ'' ''امین'' کا جزلاینفک بن جائے۔ حضرت خدیجہؓ کے والد ایک کامیاب تاجر تھے۔ صرف اپنے قبیلہ میں ہی بڑی عظمت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے بلکہ تمام قریش میں اپنی خوش معاملگی و دیانت داری کی وجہ ہر دلعزیز و محترم تھے۔ حضرت خدیجہؓ بچپن ہی سے نہایت نیک اور شریف الطبع تھیں۔ ان کی پہلی شادی ابو ہالہ سے ہوئی۔ اُن سے دو لڑکے ہوئے وہ ہالہ کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ کی دوسری شادی عتیق بن عابد مخزومی سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ عتیق بھی انتقال کر گئے۔ اس کے بعد آپ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

حضورؐ سے نکاح سے قبل جب حضرت خدیجہؓ بیوہ تھیں تو آپ اپنا کچھ وقت خانہ کعبہ میں گزارتی تھیں۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے انہیں نکاح کے پیغامات بھیجے لیکن آپ نے ان سب کو ردّ کر دیا۔ کیونکہ پے در پے صدمات نے ان کی طبیعت دنیا سے اچاٹ کر دی تھی۔ ان کے والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کی تجارت ایک طرف شام تک اور دوسری طرف یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کاروبار کے لئے انہوں نے کئی عرب، یہودی، عیسائی ملازموں کو مقرر کر رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضورؐ اپنے پاکیزہ اخلاق کی وجہ امین کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔ یہ بات حضرت خدیجہؓ تک بھی پہنچ چکی تھی ان کی تجارت کے لئے ایک ایسے ہی شخص کی سخت ضرورت تھی۔ آپ نے حضورؐ کو

پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ اس تجارت کو شام تک لے جایا کریں تو دوسرے لوگوں سے دو چند معاوضہ آپ کو دیا جائے گا۔ آپؐ نے یہ پیغام قبول فرمایا اور تجارت کے لئے عازم بصرہ ہوئے۔ آپؐ کی دیانت داری وسلیقہ شعاری کی بدولت تجارت چمک اٹھی۔ ہر ایک حضورؐ کا مداح بن گیا۔ حضرت خدیجہؓ بے حد متاثر ہوئیں اور لونڈی نفیسہ کی معرفت حضورؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضورؐ اپنے چچا ابو طالب اور دیگر اکابر خاندان کے ساتھ حضرت خدیجہ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر پچیس سال کی اور خدیجہؓ کی عمر چالیس سال کی تھی۔

نکاح کے بعد حضورؐ اکثر مکہ کے پہاڑوں میں جا کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔ اسی طرح دس برس کا زمانہ گزر گیا۔ ایک دن اسی غارحرا میں معتکف تھے کہ جبرئیل امین آپؐ کے پاس تشریف لائے۔ آپ کے سینہ کو داب کر اقراء کا سبق دیا۔ حضورؐ نے فرمایا ''میں پڑھا لکھا نہیں''، جبرئیل نے پھر یہی کہا اور حضورؐ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ جبرئیل نے کہا ''پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ پڑھ تیرا پروردگار بہت رحم والا ہے جس نے قلم سے آدمی کو علم سکھایا جو نہ جانتا تھا''۔ یہ تھی پہلی وحی۔ حضورؐ کی زبان مبارک پر یہی کلمات جاری ہوگئے۔ یہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ حضورؐ حیران پریشان گھر تشریف لے آئے۔ حضرت خدیجہؓ سے کہا ''مجھے کمبل

اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ''۔ آپ پر خوف و ہراس طاری تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی کہ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ آپ کہاں تھے؟ میں فکر مند تھی اور کئی آدمیوں کو آپ کی تلاش میں بھیج چکی تھی۔ حضورؐ نے تمام واقعہ حضرت خدیجہؓ کے سامنے بیان کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا آپ سچ بولتے ہیں، غریبوں کی مدد فرماتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ امانت گزار ہیں۔ سب کا دکھ درد دور کرتے ہیں۔ رحم و کرم کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔ حضرت خدیجہؓ کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ فیضان سماوی کا ظہور ہونے والا ہے۔ عالم انسانیت پر فلاح و بہبودی کا انقلاب آنے والا ہے۔ پھر آپ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جو زبور و انجیل کے بڑے عالم تھے۔ بت پرستی ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے۔

ورقہ نے جب سارا ماجرا سنا تو فوراً بول اٹھے ''یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ اے کاش کہ میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی''۔ حضورؐ نے پوچھا ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا ''ہاں جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے جب کسی پر نازل ہوتا ہے تو دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپؐ کی بھرپور مدد کروں گا''۔ کچھ مدت کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خدیجہ کو یقین ہو گیا کہ حضورؐ منصب رسالت پر فائز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بلا تامل

حضورؐ پر ایمان لے آئیں۔ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ حضورؐ کو ایک مومنہ مل گئی۔ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے والی ایک خاتون تھیں جس کا نام خدیجۃ الکبریٰؓ ہے۔

نبوت کے بعد حضرت خدیجہؓ نو سال زندہ رہیں۔ یہ پر آشوب زمانہ تھا۔ اس مدت میں آپ نے صدہا صعوبتیں سہیں۔ مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ حضورؐ کا ہر لمحہ، ہر آن، ہر حال ساتھ دیتی رہیں۔ رفاقت و جان نثاری کی مثال قائم کر دی۔ تبلیغ حق میں حضورؐ کا دست و بازو ثابت ہوئیں۔ اپنا تمام مال و زر اسلام پر نثار کر دیا۔ اپنی ساری دولت یتیموں، یسیروں، بے کسوں، لاچاروں، ناداروں کی حاجت روائی میں لگا دیں۔ حضورؐ کفار کی بیہودگی و شرارت و مظالم پر کبھی کبھی کبیدہ خاطر ہوتے تو حضرت خدیجہ عرض کرتیں ''یا رسول اللہ! آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ بھلا کوئی ایسا رسول بھی آج تک آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو''۔ اس تسلی سے حضورؐ کو تسکین ہو جاتی تھی۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے ''میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا''۔

حضرت بی بی خدیجہؓ کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو چھ لڑکے

لڑکیاں دیں۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے جو کمسنی میں ہی انتقال کر گئے۔ پھر زینب، ان کے بعد عبداللہ، وہ بھی صغرسنی میں ہی انتقال کر گئے۔ پھر رقیہ، پھر امّ کلثوم اور پھر فاطمۃ الزہرا پیدا ہوئیں۔

نبوت کے ساتویں سال میں مشرکینِ قریش نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔ حضرت خدیجہ بھی اس مصیبت میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ وہ پورے تین برس تک اس محصوری کے روح فرسا آلام و مصائب بڑے صبر و استقلال کے ساتھ جھیلتی رہیں۔ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندان بنو ہاشم سے قربت کرے گا نہ اِن کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک وہ حضورؐ کو قتل کر کے حوالہ نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ لوگ پتے کھا کھا کر رہتے تھے۔ حضرت سعد بن وقاص کا بیان ہے کہ میں نے ایک سوکھا چمڑا پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ بچے بھوک سے روتے تھے اور قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دن حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھوڑے سے گیہوں حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجا۔ راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ایک اور کافر کو رحم آ گیا اور چھیننے سے منع کر دیا۔ نبوت کے دسویں سال میں یہ ظالمانہ محاصرہ ختم ہوا لیکن اس کے بعد

حضرت خدیجہ زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ اسی سال رمضان المبارک میں ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔

حضورؐ نے معالجہ اور تسکین و تشفی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن اجل کا پیغام آہی گیا۔ 11 رمضان المبارک ۱۰ نبوی کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور مکہ کے قبرستان حجون میں دفن ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ پچیس سال حضورؐ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کی۔ آپ کی وفات سے چند ہی روز قبل حضورؐ کے چچا ابو طالب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے۔ یہ اسلام کا سخت ترین زمانہ تھا۔ کفار کا ظلم شباب پر تھا۔ حضورؐ اس سال کو سال غم (عام الحزن) فرمایا کرتے تھے۔

حضور کو حضرت خدیجہؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کی وفات کا آپ کو بے پناہ صدمہ ہوا اور آپ اکثر ملول رہنے لگے۔ وفات کے بعد بھی آپؐ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو گوشت بھیجتے اور بعد میں کسی اور کو دیتے۔ حضرت خدیجہؓ کا کوئی رشتہ دار جب کبھی آپ کے پاس آتا تو آپ اس کی بے حد خاطر و مدارات فرمایا کرتے۔ رحلت خدیجہ الکبریٰ کے بعد موت تک حضور اس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لے جاتے جب تک حضرت خدیجہ کی اچھی طرح تعریف نہ کر لیتے۔ اسی طرح جب گھر تشریف لاتے تو ان کا ذکر کر کے ان کی خوبیاں یاد فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھے جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ انتقال کے بعد حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ حضورؐ سے ملنے آئیں اور قاعدہ کے مطابق اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ کی آواز سے ملتی تھی۔ آپؐ کے کانوں میں آواز پڑی تو آپؐ کو حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں اور آپؐ بے جھجک اٹھے اور فرمایا کہ ''ہالہ'' ہوں گی۔ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں۔ ان کو رشک ہوا۔ بولیں کہ آپ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں۔ جو مر چکیں اور خدا نے آپ کو ان سے اچھی بیویاں دیں۔ حضورؐ کا روئے مبارک سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی خدمات کا تفصیلی ذکر شروع فرمادیا۔ حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی۔ جس گھر میں حضرت خدیجہؓ رہتی تھیں امیر معاویہ نے اس کو خرید کر مسجد بنادیا اور آج بھی وہ وہی نام سے موسوم ہے۔

غرض ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ طاہرہ اسلام کی مقبول ترین خاتون ہیں۔ ان کا مقام اس بات سے واضح ہے کہ اللہ پاک نے خود انہیں سلام بھیجا تھا اور جبرئیل امین نے سلام کہا تھا۔ امہات المومنین میں سب سے طویل مدت، پچیس سال کا عرصہ حضورؐ کی خدمت کرنے کا شرف صرف انہیں کو حاصل ہے۔ یہ مکہ کا وہ دَور تھا جبکہ ظہور اسلام سے قبل حضورؐ قریش مکہ کے لئے انسان کامل، پیکر حسن اخلاق و قائد بے مثال تھے مگر ظہور اسلام کے فوراً بعد انہیں لوگوں

کے لئے آپؐ آفت غیبی و دشمن طرز زندگی بن گئے۔ ایسے دَور میں جبکہ حضورؐ رحمت عالم بننے کے مرحلوں سے گذر رہے تھے اور پھر نبوت کے بعد رحمت عالم بن چکے تھے حضرت بی بی خدیجہؓ حضورؐ کی رفاقت میں جسم و جان کی طرح لگی رہیں۔ یہ سعادت کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ پہلی وحی کے موقع پر جب حضورؐ خود گھبرا گئے تھے آپؐ کو تسلّی و تشفی دینے والی واحد ہستی حضرت خدیجہ کی ذات اقدس تھی۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خود مالک ایک خاتون کے ذریعہ اپنے محبوب کی ڈھارس بندھا رہا ہے۔ غور کیجئے اس خاتون کا کیا مقام ہوگا جس سے مالک خود یہ کام لے!

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی بُرج کا دُرِ مکنون

علامہ اقبالؔ

ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن

ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن 11/اپریل 1958ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے مدراس یونیورسٹی سے بی-ایس-سی، ایم-اے (اردو)، ایم-فل (اردو) اور پی ایچ-ڈی (اردو) کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

اردو لکچرر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے آپ ینو کالج مدراس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی دو کتابیں ''نواب محمود حیات اور شاعری'' اور ''ہنستے زخم'' شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب کے آپ مصنف ہیں اور دوسری کے مرتب۔ ''ٹملناڈو کے تعلیمی و ادبی اداروں کی اردو خدمات'' کے موضوع پر آپ کی ایک اور کتاب زیر طبع ہے۔ ہندوستانی بیچ والی بال ٹیم کے قائد کی حیثیت سے حکومت نے آپ کو جاپان، تھائی لینڈ، ملیشیا اور سری لنکا بھیجنے کا اعزاز بھی بخشا ہے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے انعقاد کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

معنی اور اشارے

باطل : غلط - بے اصل - بے ہودہ

ذات اقدس : مقدس ذات

رفیقۂ حیات : شریک زندگی

حق شناس : حق پہچاننا - جوہر شناس - حق پسند

بشارت : خوش خبری

سبقت : برتری - کسی سے آگے نکل آنا - فوقیت

ریاضت : محنت - مشقت

دشوار گذار : وہ راستہ یا جگہ جہاں سے گذرنا مشکل ہے۔

طعام	:	کھانا
روح فرسا	:	روح کو تباہ کرنے والا
خوں افشاں	:	خون چھڑکنا
مصائب	:	مصیبت کی جمع
تصدیق	:	ثبوت - سچ ہونے کی تائید
جدامجد	:	پڑدادا - حضرت آدم
طاہرہ	:	پاک باز عورت
اوصاف جمیلہ	:	اچھی خوبیاں
جز لاینفک	:	وہ حصّہ جو علاحدہ نہ ہو سکے
منشا	:	ارادہ
پے در پے	:	مسلسل - لگاتار
دوچند	:	زیادہ - دُگنا
عازم	:	عزم کرنے والا - ارادہ کرنے والا
مداح	:	تعریف
اکابر خاندان	:	خاندان کے بڑے لوگ
معتکف	:	اعتکاف میں بیٹھنے والا
وحی	:	خدا کے وہ احکام جو نبیوں پر اترتے تھے
ضمیر	:	دل

فیضان سماوی	:	اللہ کا فیضان
ظہور	:	ظاہر ہونا
ناموس	:	آبرو - شرم - اہل خانہ - حضرت جبرئیل کا لقب
مومنہ	:	مومن کی تانیث
مومنہ	×	مومن
پُر آشوب	:	فتنہ وفساد سے بھرا ہوا۔
صدہا	:	سینکڑوں
صعوبتیں	:	مصیبتیں
خندہ پیشانی	:	ہنس مکھ - خوش مزاجی
حاجت روائی	:	حاجت یا ضرورت پوری کرنا
کبیدہ خاطر	:	رنجیدہ دل - آزردہ دل
تمسخر	:	مذاق
ڈھارس بندھانا	:	ہمت قائم ہو جانا - حوصلہ افزائی کرنا
آویزاں	:	لٹکانا
محاصرہ	:	گھیرنا
ملول	:	اداس - غمگین
امہات المومنین	:	مومنوں کی مائیں - حضورؐ کی ازواج مطہرہ کو امہات المومنین کہا جاتا ہے۔

زبان و بیان

مذہبی اور دینی نقطہ نظر سے ''ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ'' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی زندگی کے تمام واقعات پوری صحت وعقیدت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ آپ سب اچھی طرح واقف ہیں کہ امہات المومنین میں حضرت خدیجہ کا کیا مقام تھا۔ تاریخ اسلام میں آپ اولین خاتون تھیں جنھوں نے اسلام قبول فرمایا تھا۔ اور دین اسلام کی تبلیغ میں حضور اکرم ﷺ کا ہر ہر قدم پر ساتھ دیا۔ اس مضمون میں آپ کے کردار اور اوصاف حمیدہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ تاریخ اسلام کی ایک مثالی خاتون تھیں۔ جزیرۂ عرب کے دولت مند تاجروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ جب آفتاب رسالت طلوع ہوا تو اسکی پہلی کرن نے انہیں کے سینے کو منور کیا تھا۔ آپ سرور کائنات رسول عربی ﷺ کی صرف رفیقۂ حیات ہی نہ تھیں بلکہ ایسی حق شناس کہ ہر کٹھن موقع پر اور ہر دشوار گذار مرحلہ میں اپنے تدبّر کا نمونہ پیش کیا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد حضرت خدیجہ کا کردار اور بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ آپ کی پاک دامانی، مزاج کی استقلالی اور سلیقہ شعاری نے قبیلۂ قریش اور کفار مکہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ آپ ہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ امہات المومنین میں سب سے طویل تک حضور اکرم ﷺ کی خدمت کرنے کا شرف صرف انہیں کو حاصل ہے۔

غور وفکر

I مناسب ترین جواب تلاش کیجئے:

1) آپ کا نام خدیجہ اور لقب ....

1- زہرہ تھا

2- آمنہ تھا

3- طاہرہ تھا

2) حضرت خدیجہؓ کی تجارت ایک طرف شام تک اور دوسری طرف ....تک پھیلی ہوئی تھی۔

1- ترکی

2- یمن

3- ریاض

II قوسین میں دیئے گئے مناسب الفاظ سے خالی جگہوں کو پُر کیجئے:

1) نکاح کے بعد حضور اکرمؐ اکثر مکہ کے .... میں جا کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔ (غاروں - پہاڑوں - چٹانوں)

2) پھر آپ کو ساتھ لے کر اپنے .... بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں۔ (ماموزاد - چچازاد - خالہ زاد)

III مناسب جوڑ لگا کر جملہ پورا کیجئے:

1-	حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی	-	نکاح کا خطبہ پڑھا
2-	حضورؐ سے نکاح سے قبل	-	چھ لڑکے لڑکیاں دیں
3-	حضرت ابو طالب نے	-	حضورؐ سے ملنے آئیں
4-	خدیجہ کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو	-	حضرت خدیجہ بیوہ تھیں
5-	ایک دفعہ انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ	-	ابو ہالہ سے ہوا

IV مختصر سوالات:

1- حضرت خدیجہؓ کا لقب کیا تھا اور وہ کس بات کی دلالت کرتا تھا؟

2- حضرت خدیجہؓ کے والد اور والدہ کا نام لکھئے؟

3- حضرت خدیجہؓ کس قسم کی خاتون تھیں؟

4- حضرت خدیجہؓ کے والد کا کیا پیشہ تھا اور وہ اپنے قبیلے میں کیا مقام رکھتے تھے؟

5- حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو نکاح کا پیغام کس کی معرفت بھیجا تھا اور حضورؐ کا نکاح کس نے پڑھوایا؟

6- نکاح کے بعد حضورؐ اکثر کہاں رہتے تھے؟

7- ورقہ بن نوفل کون تھے؟

8- ورقہ نے سارا ماجرا سن کر کیا کہا؟

V توضیحی سوالات:

ذیل کے اقتباسات کی بحوالۂ متن وضاحت کیجیے:

1- ''یارسول اللہ وہ ایک بڑھیا بیوہ عورت تھیں خدا نے ان کے بعد آپ کو ان سے بہتر بیوی عنایت کی۔''

2- ''آپؐ اس تجارت کو شام تک لے جایا کریں تو دوسرے لوگوں سے دو چند معاوضہ آپ کو دیا جائے گا۔''

3- ''آپ کہاں تھے میں فکر مند تھی اور کئی آدمیوں کو آپ کی تلاش میں بھیج چکی تھی۔''

4- اگر میں اُس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔

5- کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا۔

VI تفصیلی سوالات:

1- حضرت خدیجہؓ کے اوصاف جمیلہ پر روشنی ڈالیے۔

2- حضرت خدیجہؓ کی تجارت کا حال لکھیے۔

3- حضورؐ پر پہلی وحی کے نزول کا واقعہ بیان کیجیے۔

4- حوالوں سے لکھیے کہ حضرت خدیجہؓ، حضورؐ کی ڈھارس کس طرح بندھاتی تھیں۔

5- نبوت کے ساتویں سال میں مشرکین قریش نے کیا کیا ستم ڈھائے۔

ہماری متحدہ قومیت

مرتب: شیخ زین العابدین عمری

15 اگست 1947ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو ملک کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ ہندو، مسلم اور سکھوں کے درمیان آپسی نفرت نے انتشار اور افتراق پیدا کر دیا تھا۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ فرقہ پرستی اپنے شباب پر تھی۔ تقسیم ملک کی باعث بھیانک فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں معصوم لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ نقل آبادی سے بے شمار لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے اور سڑکوں پر آ گئے۔ کل تک جن کے گھر میں بہت کچھ تھا آج دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ ایسے ماحول میں سامراجی حکومت کے خاتمے کے بعد جب مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور آئی تو سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ملک کے تمام باشندوں میں اتحاد قائم کیا جائے۔ ہندوستان اپنے رقبے کے لحاظ سے سابق سوویت یونین کو چھوڑ کر تقریباً پورے یوروپ کے برابر ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی آبادی والا دوسرا ملک ہے۔ یہاں تقریباً 250 زبانیں اور بولیاں ہیں۔ یہی نہیں دنیا کے بیشتر مذہب جیسے ہندو دھرم، اسلام، عیسائی، سکھ، بدھ، جین اور زرتشت کے ماننے والے یہاں آباد ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جس میں اتنی بڑی تعداد میں مذہب کے ماننے

والے پائے جاتے ہوں۔ اسی طرح لباس، خوراک اور عادات واطوار میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں غیر محسوس طور پر ایسا اتحاد ہے جو کثرت میں وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے ایسے رنگا رنگ ملک کے نظام حکومت کے لیے ضروری تھا کہ یہاں جمہوری اور سیکولر نظام حکومت قائم ہو جس کے تحت ہر ایک مذہب، عقیدے، زبان اور تہذیب کو پنپنے کے لیے مکمل آزادی حاصل ہو تبھی ملک کثرت میں وحدت یا متحدہ قومیت بن کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

جمہوری اور سیکولر طرز حکومت کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے تحریری طور پر ایک دستورِ اساسی یا آئین بنایا جائے، اس کام کے لیے دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آیا جس میں ہندوستان کے مختلف فرقوں، علاقوں اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی نمائندوں کے ساتھ ساتھ ملک کے بہترین قانون دانوں نے بھی دستور یا آئین سازی مین حصہ لیا۔ 2 دسمبر 1946ء کو اس اسمبلی نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں اپنا کام شروع کیا، اور اسمبلی کو اپنا کام پورا کرنے میں تقریباً تین سال لگے۔ دستور ساز اسمبلی نے 26 نومبر 1949ء کو بنایا گیا آئین منظور کرلیا۔ لیکن اس کے نفاذ کے لیے 26 جنوری 1950ء کی تاریخ مقرر کی گئی اور اس دن ہندوستان ایک جمہوریہ بن گیا۔ تب سے ہر سال 26 جنوری کو یومِ جمہوریت منایا جاتا ہے۔

ہندوستا کے آئین میں ہر شہری کے لیے چھے بنیادی حقوق ہیں۔

(1) مساوات کا حق

(2) آزادی کا حق

(3) لوٹ کھسوٹ سے حفاظت کا حق

(4) مذہبی آزادی کا حق

(5) تعلیمی اور تہذیبی حق اور

(6) دستوری چارہ جوئی کا حق

آئین کے یہ چھے بنیادی حقوق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ملک میں رہنے والے مختلف مذاہب، مختلف نسلوں اور زبانیں و بولیاں بولنے والوں کے درمیان کسی طرح کا بھید بھاؤ نظر نہ آئے اور ہندوستان کے رہنے والوں میں ''اتحاد'' کی روح جسے متعدد بار ختم کرنے کی کوشش ہوئی، برقرار رہے اور ہندوستان دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم ملک کے ساتھ ساتھ ایک ایسی قوم کے روپ میں ابھرے جو اپنی رنگا رنگی کے ساتھ متحد بھی ہو۔

''متحدہ قومیت'' انسانوں کی ایک بڑے گروہ یا جماعت جس میں مختلف مذاہب، نسل، زبان اور مختلف عادات واطوار اور کھانے پینے، رہن سہن کے طریقوں کے اختلاف کے باوجود اپنی مرضی سے ایک سیاسی اور معاشی نظام کو اختیار کریں اور ملک کے آئین کے پابند ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا اور ملک

میں رہنے والے مذہبی، نسلی یا لسانی اختلافات کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کرلیں تو اس طرح نہ تو جمہوریت برقرار رہ سکتی ہے نہ افراد کے درمیان اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ یہاں عوام میں قومی یک جہتی ہو۔ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف نسلوں اور علاقوں کے لوگ ماضی میں یہاں آئے انھوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنالیا اور یہیں بس گئے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کا ایک حصہ بن گئے۔ چنانچہ آئین بنانے والوں نے اس کا خیال رکھا کہ یہ آئین سبھی کے لیے قابل قبول ہو اور اس کی کسی دفعہ سے یہ نظر نہ آئے کہ کسی خاص فرقے، طبقے، نسل، مذہب یا زبان بولنے والوں کو ترجیح دی گئی ہے۔

ہندوستان کے آئین میں مرکز اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کو تقسیم کردیا گیا ہے تاکہ مرکز اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ نہ ہو۔ سارے ملک کی حفاظت یک جہتی اور ترقی کے لیے ضروری قانون اور اختیارات مرکزی سرکار کے پاس ہوتے ہیں جبکہ تعلیم، صحت، صنعت وغیرہ کے معاملے صوبائی حکومت کے پاس ہوتے ہیں۔ مرکز میں چونکہ انتظامیہ اور آئینی اصول و ضوابط پر عمل درآمد اور قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ ہوتی ہے اس لئے پورے ملک کی ریاستوں سے آبادی کے تناسب کے اعتبار سے عوامی نمائندے (ممبر پارلیمنٹ) الیکشن میں جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچتے ہیں۔ ریاستی یا صوبائی انتظام

اسمبلیوں، کارپوریشن، میونسپل کونسلیں اور پنچایتی اداروں کے تحت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آبادی کا بڑا حصہ شہروں کے مقابلے دیہات یا گاؤں میں رہتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ دیہات اور گاؤں کا انتظام وہاں کے رہنے والوں کے ہاتھ میں ہو اور انھیں ایسا نہ لگے کہ شہر کے رہنے والے دیہات کو نظر انداز کر رہے ہیں اور گاؤں کی خوشحالی اور ترقی کے لیے توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اس لیے گاؤں میں پنچایتی راج شروع کیا گیا۔ آئین کے تحت ملک کا سارا انتظام ان انتظامی اداروں میں اس لیے تقسیم کیا گیا کہ ملک کا ہر شہری آئین میں دیے گئے حقوق اور فرائض سے واقف رہے اور ان پر عمل درآمد بھی ہو۔ اس طرح پورا ملک کثرت میں وحدت یا متحدہ قومیت کا مظہر ہو۔

ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں بے شمار زبانیں اور بولیاں بولنے والے رہتے ہیں یہ ضروری تھا کہ ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی لسانی نظام بھی قائم کیا جائے تاکہ صوبائی ریاستوں میں زبان کا مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ ہمارے دستور کے آٹھویں شیڈول میں بہت سی زبانوں کے تحفظ کی ضمانت ہے، ان میں ایک اردو بھی ہے۔

اردو زبان کی ساخت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جمہوریت کی بنیادوں کو استوار کرنے اور اسے استحکام بخشنے میں اردو نے خاص رول ادا کیا ہے۔ اردو جمہور کی زبان ہے اس کے بولنے لکھنے یا پڑھنے والے کسی ایک

علاقے، مذہب، طبقے یا فرقے کے لوگ نہیں ہیں بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اور کئی زبانوں اور بولیوں کے بولنے والے شامل ہیں۔ اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ اردو آج بھی شمال سے جنوب تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سامراجیوں کے خلاف عوامی جدوجہد اور آزادی کی قومی تحریک میں سب سے زیادہ موثر رول اردو ہی نے ادا کیا ہے۔ اس لیے اردو کو اتحاد اور اشتراک کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو ہندوستان کی متحدہ قومیت کی ایک روشن علامت ہے۔

متحدہ قومیت کو مضبوط بنانے میں ذرائع ابلاغ کی خدمات کو بھی کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ہمیشہ ملک کی وحدت کو برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔ آج پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں الیکٹرونک میڈیا زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن آزادی سے پہلے پرنٹ میڈیا نے جس طرح آزادی کی لڑائی میں اپنا رول نبھایا وہ لائق ستائش ہے۔ ہندوستان کے بہت سے صحافیوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، سزائے موت سے دوچار ہوئے۔ لیکن اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔ آج الیکٹرونک میڈیا ٹیلی ویژن کے مختلف چینل ملکی سالمیت، قومی وحدت اور مشترکہ ثقافت کے فروغ کے لیے جو پروگرام پیش کر رہے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی ان سے قومی اتحاد پیدا

ہو گا۔ قومی یک جہتی کے عناصر کو فروغ ملے گا اور ایسا کرنا متحدہ قومیت کو طاقتور بنانا اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

شیخ زین العابدین عمری:

شیخ زین العابدین ضلع کڑپہ، آندھرا پردیش کے رہنے والے ہیں۔ 1962ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم امدادیہ راچوٹی میں چار سال تک دینی تعلیم پائی۔ بعد میں دو سال باقیات الصالحات ویلور میں تعلیمی مراحل طے کئے۔ آخری 6 سال جامعہ دارالسلام عمرآباد سے منسلک ہوکر 1984ء میں فراغت کی سند حاصل کی۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور افضل العلماء کرنے کے بعد حیدرآباد سے پنڈت ٹریننگ پاس کیا۔ میسور یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو) اور انا ملے یونیورسٹی سے بی-ایڈ اور ایم-ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1994ء میں آپ کا تقرر بحیثیت اردو منشی مسلم ہائر سکنڈری اسکول ٹرپلیکین چینئی میں ہوا اور بعدازاں ترقی کر کے پی-جی-اسسٹنٹ ہوگئے۔ فی الحال آپ اسی عہدے پر درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ این-سی-ای-آر-ٹی دہلی کی اردو نصابی کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں اور جب ٹملناڈو میں اردو نصابی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی تو آپ اس کی مجلس ادارت کے رکن نامزد ہوئے۔

معنی اور اشارے

انتشار	:	پھیلانا
افتراق	:	جدائی پیدا کرنا
شباب	:	جوانی
ضائع	:	رائگاں بے فائدہ
سامراجی حکومت	:	انگریزوں کی حکومت
اتحاد	:	ملاپ - دوستی - محبت
بیشتر	:	زیادہ
خوراک	:	کھانا - غذا
اطوار	:	طور کی جمع - طرز - ڈھنگ
وحدت	:	ایک ہونا
گامزن	:	تیز رفتار
دستور	:	قاعدہ - رسم ورواج
تحریری	:	لکھی ہوئی
نمائندوں	:	قائم مقام - ترجمان - نمائندہ کی جمع
متعدد	:	بہت - کئی
گروہ	:	جماعت - ٹولی

لسانی	:	زبان سے متعلق
ماضی	:	گزرا ہوا زمانہ
ترجیح	:	فضیلت - فوقیت
صنعت	:	پیشہ - ہنر
صوبائی	:	صوبہ سے متعلق
دیہات	:	گاؤں - قریہ -
مظہر	:	ظاہر ہونے کی جگہ
وسیع	:	چوڑا - کشادہ
ساخت	:	بناوٹ - وضع
استوار	:	مضبوط - پائیدار
استحکام	:	پختگی - استقلال
اشتراک	:	شرکت
ذرائع	:	ذریعہ کی جمع
ابلاغ	:	پہنچانا، بھیجنا
صعوبتیں	:	تکلیفیں
عناصر	:	عنصر کی جمع اصلی اجزاء
سالمیت	:	پورا ہونے کی حالت - یک جہتی

زبان وبیان:

زیر نظر مضمون میں ہماری متحدہ قومیت کے تصور کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع وعرض ملک میں سینکڑوں بولیاں بے شمار زبانیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں۔ لہذا یہاں پر اتحاد واتفاق اور قومی یکجہتی کو قائم کرنے کی ضرورت بھی اُتنی ہی شدید محسوس ہوتی ہے۔ ملک کی سالمیت اور ہماری متحدہ قومیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہاں جمہوری اور سیکولر نظام حکومت قائم کرنے کا فیصلہ اُس وقت لیا گیا جبکہ سامراجی حکومت کے خاتمے کے بعد ملک آزاد ہوا تھا۔ آزادی کے فوراً بعد چونکہ ملک کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ہندو مسلم اور سکھوں کے درمیان آپسی نفرت نے انتشار اور افتراق پیدا کر دیا تھا۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا بن گیا تھا۔ فرقہ پرستی اپنے شباب پر بھی۔ تقسیم ملک کے باعث بھیانک فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں معصوم لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ نقل آبادی سے بے شمار لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ایسے ماحول میں ملک کے اندر ایک ایسے نظام اور ایک ایسی ہم آہنگی اور اتحاد کی ضرورت پیش آئی جس سے متحدہ قومیت قائم ہو سکے۔ اور ملکی سالمیت، قومی وحدت اور قومی یکجہتی کے عناصر کو فروغ ملے۔ اس مضمون میں انہیں تصورات کی طرف قارئین کی توجہ منزول کرائی گئی ہے۔

غور و فکر:

I   مناسب ترین جواب تلاش کیجئے:

1- ہندوستان کے آئین میں ہر شہری کے لئے .... بنیادی حقوق ہیں۔

(الف) چار   (ب) تین   (ج) چھ

2- یہ دنیا میں سب سے بڑی آبادی والا دوسرا ملک ہے یہاں تقریباً .... زبانیں اور بولیاں ہیں۔

(الف) 350   (ب) 250   (ج) 150

II   قوسین میں دئے گئے مناسب الفاظ سے خالی جگہوں کو پر کیجئے:

1- فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں .... کی جانیں ضائع ہوئیں

(الف) بوڑھوں   (ب) معصوم لوگوں

(ج) بہادروں

2- ہندوستان جیسے ملک کے لئے سب سے ضروری ہے کہ یہاں عوام میں .... ہو۔

(الف) دلچسپی   (ب) قومی یکجہتی

(ج) مذہبی

III مناسب جوڑ لگا کر جملہ پورا کیجئے:

1)	26 جنوری 1950ء	-	چھ بنیادی حقوق ہیں
2)	2 دسمبر 1946ء کو قانون ساز اسمبلی نے	-	دیہات یا گاؤں میں رہتا ہے
3)	ہندوستان کے آئین میں	-	مرکز اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔
4)	ہندوستان میں آبادی کا بڑا حصہ	-	ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں کام شروع کیا
5)	ہر شہری کے لئے	-	یوم جمہوریہ

IV مختصر سوالات:

1- ہندوستان کب آزاد ہوا؟

2- ہزاروں معصوم لوگوں کی جانیں کیوں ضائع ہوئیں؟

3- کس دھرم کے ماننے والے یہاں موجود ہیں؟

4- کیا ہر ہندوستانی کے لئے کچھ حقوق مقرر ہیں؟

5- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کو کیوں تقسیم کیا گیا؟

6- متحدہ قومیت سے کیا مراد ہے؟

V توضیحی سوالات:

ذیل کے اقتباسات کی بحوالۂ متن تشریح کیجئے:

1- ''یہ دنیا میں سب سے بڑا آبادی والا دوسرا ملک ہے۔''

2- ''دستور ساز اسمبلی نے 26 نومبر 1949ء کو بنایا گیا آئین منظور کر لیا۔''

3- ''اسلئے اردو کو اتحاد اور اشتراک کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔''

4- ''متحدہ قومیت کو مضبوط بنانے میں ذرائع ابلاغ کی خدمات کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

VI تفصیلی سوالات:

1- انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

2- ہندوستان کے آئین میں ہر شہری کے لئے کن باتوں کی ضمانت دی گئی ہے؟

3- اردو زباں کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟

4- سامراجیوں کے خلاف کن کن لوگوں نے حصہ لیا؟

5- لسانی جھگڑوں سے کیا مراد ہے؟

قواعد

ہم مہذب شہری ہیں۔ جس طرح وضع قطع، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے میں مہذب طور طریقوں سے کام لیتے ہیں، اسی طرح گفتگو میں بھی تہذیب یافتہ یا تعلیم یافتہ ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔

گھر آئے ہوئے شخص کو ایک گنوار شخص ''آؤ۔ بیٹھو'' کہے گا لیکن آپ یہ الفاظ نہیں کہیں گے بلکہ ''تشریف لایئے، بیٹھئے'' کہیں گے۔ کیونکہ ایک مہذب آدمی کے کہنے کا یہی طریقہ ہے۔ مہذب آدمی چاہتا ہے کہ ہر بات بہتر سے بہتر اور شائستہ انداز میں کہے۔ ایسے میں آپ کا یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ بہتر کیا ہے اور کیا نہیں۔ آپ جانتے تھے کہ ''آؤ بیٹھو'' کہنا مہذب لوگوں کا انداز نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے ''تشریف لایئے، بیٹھئے'' کہا۔

تشریف لایئے، بیٹھئے آپ کا سنا سنایا جملہ ہے اس لئے آپ نے آسانی سے کہہ دیا لیکن کئی ایسی باتیں ہیں جنہیں آپ نے اب تک سنا نہ ہو۔ اس صورت میں آپ یہ فیصلہ کیسے کریں گے کہ کونسا انداز مہذب ہے اور کونسا انداز غیر مہذب لوگوں کا ہے اگر آپ کو زبان کے اصول و قواعد سے واقفیت ہو تو آپ کی یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے قواعدِ زبان کو جاننے کا یہی ایک فائدہ ہے۔

اب ذرا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

یہ لڑکا بڑا بہادر ہے۔

کسی لڑکے کی بہادری کی تعریف کرنا ہو تو ہم یہ جملہ کہتے ہیں۔

اسی بات کو ہم اور بہتر طریقے سے اس طرح کہہ سکتے ہیں۔

یہ لڑکا شیر کی مانند بہادر ہے۔

اس جملے میں لڑکے کی بہادری کو شیر کی بہادری کے برابر بتا کر لڑکے کی بہادری کا درجہ قائم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ شیر جانوروں میں سب سے بہادر جانور ہے۔

اسی بات کو آپ نے اس طرح کہتے ہوئے بھی سنا ہوگا:

یہ لڑکا شیر ہے۔

اس جملے کے بھی وہی معنی ہیں جو اوپر کے جملہ کے ہیں لیکن اس جملہ میں کئی الفاظ کم ہو گئے ہیں۔ یہاں بہادری کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا گیا اور جملہ سنتے ہی ہم سمجھ گئے کہ لڑکا شیر کی طرح بہادر ہے۔

ان تین جملوں میں پہلے جملہ سے دوسرا جملہ بہتر ہے کیونکہ پہلے جملے میں صرف بہادری ظاہر کی گئی تھی، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ لڑکا کتنا بہادر ہے۔ دوسرے جملہ سے اس بہادری کی تفصیل معلوم ہو گئی کہ اس کی بہادری شیر کی

بہادری کے برابر ہے۔

جہاں تک بہادری کے درجہ کا تعین ہے، دوسرا جملہ اور تیسرا جملہ برابر ہیں لیکن انداز بیان میں تیسرا جملہ دوسرے جملہ پر سبقت لے جاتا ہے۔ آپ کا شعور خود بھی اس بات کی تائید کرے گا! مگر کس بات کی بنیاد پر یہ دوسرے جملہ پر سبقت لے جا رہا ہے۔ یہ جاننا چاہیں تو اس کے لئے آپ کو زبان کے کچھ اصول جاننے پڑیں گے۔ انہیں اصولوں کے علم کو علم بیان کہا جاتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ ایسے ہی اصول ہیں جن کے متعلق آگے بحث کی جائے گی۔

علم بیان

تشبیہ:

اب ذرا ان تین جملوں پر پھر سے غور کیجئے:

یہ لڑکا بڑا بہادر ہے۔

یہ لڑکا شیر کی مانند بہادر ہے۔

یہ لڑکا شیر ہے۔

ایک ہی بات کہی گئی ہے مگر الگ الگ انداز سے۔ پہلے جملہ میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکا بہادر ہے۔ لیکن دوسرے جملہ میں لڑکے کی بہادری

اور شیر کی بہادری میں مشابہت پیدا کی گئی ہے۔ اسی انداز بیان کو تشبیہ کہتے ہیں۔

کسی شخص یا چیز کو صفت میں دوسری چیز کے مانند قرار دینے کو تشبیہ کہتے ہیں۔

یہاں لڑکے کو شیر سے مشابہت دی گئی ہے۔

جس چیز کو مشابہت دی جاتی ہے اسے مشبہ کہتے ہیں اور جس چیز سے مشابہت دی جاتی ہے اسے ''مشبہ بہ'' کہتے ہیں۔ یہاں لڑکا مشبہ ہے اور شیر ''مشبہ بہ''۔

''طرح'' تشبیہ کو ظاہر کرنے والا حرف ہے اس لئے اسے حرف تشبیہ کہتے ہیں۔ وہ صفت جس سے تشبیہ دی گئی ہے ''بہادری'' ہے۔ اسے وجہ تشبیہ کہتے ہیں۔

مشبہ، مشبہ بہ، حرف تشبیہ اور وجہ تشبیہ، تشبیہ کے چار ارکان ہیں۔

استعارہ:

یہ لڑکا شیر ہے۔

اس جملہ میں تشبیہ کے الفاظ (کی طرح بہادر) استعمال کئے بغیر مطلب ادا کر دیا گیا ہے۔ یعنی بہادری کے وصف کا ذکر کیا ہی نہیں گیا اور اس

وصف کا پایا جانا ظاہر ہو گیا۔ اس انداز بیان کو استعارہ کہتے ہیں۔

استعارے میں ایک بات اور بھی نوٹ کرنے کی ہے۔

اگر ہم کسی لڑکی کے بارے میں یہ کہیں کہ ''یہ لڑکا گدھا ہے'' تو ہمارے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لڑکا واقعی گدھا (جانور) ہے بلکہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ لڑکا بے وقوف یا احمق ہے (گدھے کی طرح)

اسی طرح یہ لڑکا شیر ہے کا مطلب یہ نہیں کہ لڑکا جانور ہے بلکہ یہ ہے کہ لڑکا بہت بہادر ہے (شیر کی طرح)۔ گویا ان دونوں جملوں میں گدھا اور شیر کے حقیقی معنوں کو چھوڑ کر ان کے ایک خاص وصف کو لیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استعارہ میں جس چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی لئے جاتے ہیں۔

کسی لفظ کو اس کے اصلی معنی چھوڑ کر کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنے کو استعارہ کہتے ہیں۔ استعارہ میں وجہ تشبیہ اور حرف تشبیہ نہیں آتے۔

مجاز

آپ نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ استعارہ میں جو مجازی معنی لیا جاتا ہی وہ مشبہ اور مشبہ بہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے اوپر کی جملہ میں بہادری کا تعلق

ہے۔ کبھی کبھی ایسے فقرے بھی استعمال کئے جاتے ہیں کہ ان کے مجازی معنوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب یہ جملہ دیکھئے:

دریا بہتا ہے۔

ہم کہتے تو ہیں کہ دریا بہتا ہے لیکن وہاں دریا نہیں بلکہ پانی بہتا ہے۔ دریا اپنی جگہ پر رہتا ہے۔

اس طرح اگر استعارہ میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق پایا جائے تو اسے مجاز کہتے ہیں۔

کنایہ

اوپر آپ نے پڑھا کہ استعارہ میں کسی لفظ کے صرف مجازی معنی لئے جاتے ہیں کبھی کبھی ایسے فقرے بھی آجاتے ہیں جن کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی لئے جاتے ہیں۔ جیسے یہ جملہ ہے:

یہ شخص بڑے جوتوں والا ہے۔

اس کے ایک معنی تو وہی ہیں جو اس جملے سے نکلتے ہیں۔ دوسرا مطلب بڑے پاؤں والا ہوتا ہے۔

پہلا مطلب حقیقی ہے اور دوسرا مجازی۔

ایسا اظہار بیان جس میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی لئے جا سکتے ہوں کنایہ کہلاتا ہے۔

مشق

1 - تشبیہ کی تعریف کیجئے اور اس کی دو مثالیں دیجئے۔

2 - تشبیہ اور استعارہ میں کیا فرق ہے؟

3 - استعارہ اور کنایہ کی تعریف کرتے ہوئے ان دونوں کے فرق کو واضح کیجئے۔

4 - ان جملوں میں تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ کو الگ الگ کر کے لکھئے۔

(۱) چراغ جل رہا ہے۔

(۲) یہ لڑکا لومڑی ہے۔

(۳) کاغذ دودھ کی طرح سفید ہے۔

(۴) امجد کی زبان تیز چلتی ہے۔

(۵) یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟

(۶) دودھ تو بالکل پانی ہے۔

صنائع بدائع

زبان کی طرح شعر میں حسن اور زور پیدا کرنے کا بھی خاص علم ہے۔ اس علم کو علم بدیع یا صنائع بدائع کہا جاتا ہے۔ یہ حسن صنعتوں کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں یعنی شعر میں حسن یا زور دو طرح سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک الفاظ کی مدد سے دوسرے معنوی اعتبار سے۔

لفظی اعتبار سے شعر میں حسن پیدا کرنے کو صنائع لفظی کہتے ہیں اور معنوی اعتبار سے شعر میں حسن پیدا کرنے کو صنائع معنوی کہتے ہیں۔

صنائع لفظی میں سے ایک صنعت تجنیس ہے، اور صنائع معنوی کی اہم قسموں میں لف ونشر، تضاد، تلمیح، مراعات النظیر اور حسن تعلیل وغیرہ ہیں۔

صنائع لفظی

تجنیس

یہ صنائع لفظی کی ایک قسم ہے اور اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شعر میں ایسے دو لفظ لائے جائیں جو دیکھنے میں تو ایک طرح کے ہوں لیکن ان کے معنی الگ الگ ہوں۔ جیسے ذیل کے شعر میں ''مرمر'' کا لفظ ہے۔

جتنے مرمر گئے بتو! تم پر
ان کے مرقد ہیں سنگ مرمر کے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں مرمر گئے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعے میں سنگ مرمر کا لفظ لایا گیا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں مرمر کا حصہ عام ہے مگر پہلے مصرعے میں موت کے معنی میں آیا ہے اور دوسرے مصرعے میں پتھر کی ایک قسم کے معنی میں۔

صنائع معنوی

لف ونشر

شعر ہے:

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں چار چیزیں لائی گئی ہیں۔ (۱) ہمت، (۲) قسمت، (۳) دل، (۴) آنکھیں۔ ان چار چیزوں کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں چار چیزیں لائی گئی ہیں۔ (۱) ڈھونڈا، (۲) پایا، (۳) سمجھا اور (۴) دیکھا۔

ہمت کا تعلق ڈھونڈا سے، قسمت کا تعلق پایا سے، دل کا تعلق سمجھا سے اور آنکھیں کا تعلق دیکھا سے قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح شعر میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں الفاظ لائے جائیں تو اس صنعت کو لف ونشر کہتے ہیں۔

کبھی یہ تعلق بالترتیب ہوتا ہے اور کبھی ترتیب الٹ دی جاتی ہے یا آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔ جب یہ ذکر بالترتیب ہوتا ہے تو اسے لف ونشر مرتب کہتے ہیں۔ اوپر دیا ہوا شعر لف ونشر مرتب کی مثال ہے۔

اگر یہ ترتیب آگے پیچھے ہو جائے یا الٹ جائے تو اسے لف ونشر غیر مرتب کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ شعر:

نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا

تضاد

شاعر اپنے کلام میں کبھی ایسے الفاظ لے آتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں:

کیا ہنسے اور خاک کوئی روسکے
جی ٹھکانا ہو تو سب کچھ ہوسکے

اس شعر میں ہنسے اور رُ سکے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

کلام میں جب ایسے الفاظ لے آئے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اس صنعت کو تضاد کہا جاتا ہے۔

تلمیح

کبھی شاعر شعر میں کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جیسے یہ شعر ہے:

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

اس شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس طرح کلام میں اگر کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہو تو اس صنعت کو تلمیح کہا جاتا ہے۔

حسن تعلیل

کبھی کبھی شاعر اپنے شعر میں اثر پیدا کرنے کے لئے کسی واقعہ یا عمل کا اصلی سبب چھوڑ کر کوئی دوسرا دلچسپ اور شاعرانہ سبب بیان کرتا

ہے۔ جیسے:

پیاسی تھی جو سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

اس شعر میں ساحل سے موجوں کے ٹکرانے کے عمل کو امام حسین کے پیاسے ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ اسے شاعرانہ استدلال کہتے ہیں۔ یہ ایک صنعت ہے جسے حسن تعلیل کہتے ہیں۔ اس میں کسی واقعہ یا عمل کا اصلی اور حقیقی سبب چھوڑ کر کوئی دوسرا دلچسپ اور شاعرانہ سبب بیان کیا جاتا ہے۔

مراعات النظیر

اگر دونوں مصرعوں میں ایسی اشیاء کا ذکر کیا جائے جن میں باہم مناسبت پائی جائے تو شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

پہلے مصرعے میں بوئے گل (خوش بو)، نالہ (آہ) اور دود (دھواں) تینوں اپنی صفت میں باہم مناسبت رکھتی ہیں یعنی ان کی خصوصیت فضا میں بکھر جانے کی ہے۔ اس مناسبت سے دوسرے مصرعے میں ''پریشان'' کا

لفظ لایا گیا ہے۔ جس کے معنی بکھرنے یا منتشر ہونے کے ہیں۔ اس صنعت کو مراعات النظیر کہتے ہیں۔

مراعات النظیر وہ صنعت ہے جس میں کلام میں ایسی اشیاء کا ذکر لایا جائے یا ایسے الفاظ لائے جائیں جن میں باہم مناسبت ہو۔

مشق

حل کیجئے:

1- صنائع لفظی اور صنائع معنوی میں کیا فرق ہے؟
2- تجنیس کس صنعت کو کہتے ہیں؟ تعریف کرتے ہوئے دو مثالیں دیجئے۔
3- لف ونشر مرتب اور لف ونشر غیر مرتب میں کیا فرق ہے۔
4- تلمیح کسے کہتے ہیں؟ مثالیں دیجئے۔
5- حسن تعلیل کی تعریف کیجئے۔
6- بتایئے ان اشعار میں آپ کو کون کونسی صنعتیں ملتی ہیں؟

(1) خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

(2) اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

(3) دل غرق تفکر میں محو آنکھ تحیر میں
لنگر تہ دریا ہے کشتی سر ساحل

(4) سچ ہے، پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

(5) اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے

ابو خاں کی بکری

ڈاکٹر ذاکر حسین

ہمالیہ پہاڑ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اس سے بڑا پہاڑ دنیا میں کوئی نہیں ہے ہزاروں میل چلا گیا ہے۔ اس پہاڑ کے اندر بہت سی بستیاں بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی الموڑہ بھی ہے۔ الموڑہ میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ جن کا نام تھا ابو خاں، انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے۔ دن بھر چراتے پھرتے۔ ان کے عجیب و غریب نام رکھتے کسی کا ''کلو'' کسی کا منگلیا کسی کا ''گوجری'' کسی کا ''کلمہ''۔ ان سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ شام کے وقت بکریوں کو لے کر گھر میں باندھ دیتے۔ الموڑہ پہاڑی جگہ ہے اس لیے ابو خاں کی بکریاں بھی پہاڑی نسل کی ہوتی تھیں۔

ابو خاں بے چارے تھے بڑے بدنصیب۔ ان کی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رسّی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں۔ پہاڑی بکری بندھے بندھے گھبرا جاتی ہے۔ یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ میں چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا۔ وہ انھیں کھا جاتا تھا مگر عجیب بات ہے، نہ بھیڑیے کا ڈر، نہ ابو خاں کا

3

پیار، نہ شام کے دانے کا لالچ ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہاڑی جانوروں کے مزاج میں آزادی کی بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اپنی آزادی کسی قیمت پر دینے کو راضی نہیں ہوتے اور مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام و آسائش کی قید سے اچھا جانتے ہیں۔

جہاں کوئی بکری بھاگ نکلی اور ابوخاں بے چارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہری ہری گھاس میں انھیں کھلاتا ہوں، شام کو دانہ دیتا ہوں، مگر یہ کم بخت نہیں ٹھہرتیں اور پہاڑ میں جا کر بھیڑیے کو اپنا خون پلانا پسند کرتی ہیں۔

جب ابوخاں کی بہت سی بکریاں بھاگ گئیں تو بے چارے بہت اداس ہوئے اور کہنے لگے ''اب بکری نہ پالوں گا۔ زندگی کے تھوڑے دن اور ہیں، بے بکریوں ہی کے کٹ جائیں گے''۔ مگر تنہائی بری چیز ہے۔ تھوڑے دنوں ابوخاں بے بکریوں کے رہے مگر نہ رہا گیا۔ ایک دن کہیں سے ایک بکری خرید لائے یہ بکری ابھی بچّہ ہی تھی۔ ابوخاں نے سوچا کہ کم عمر بکری لوں گا تو شاید ہل جائے اور اسے جب پہلے ہی سے اچھے چارے دانے کی عادت پڑ جائے گی تو پھر یہ پہاڑ کا رُخ نہ کرے گی۔

یہ بکری تھی خوب صورت۔ رنگ اس کا بالکل سفید تھا۔ بال لمبے

لمبے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کالے سینگ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کسی نے کالی لکڑی میں خوب محنت سے تراش کر بنائے ہیں۔ لال لال آنکھیں تم دیکھتے تو کہتے ارے یہ بکری تو ہم نے لے لی ہوتی۔ یہ بکری دیکھنے ہی میں اچھی نہ تھی مزاج مین بھی بہت اچھی تھی۔ پیار سے ابوخاں کے ہاتھ چاٹتی تھی۔ دودھ چاہے تو کوئی بچّہ دوہ لے۔ نہ لات مارتی تھی نہ دودھ کا برتن گراتی تھی۔

ابوخاں بس اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس کا نام ''چاندنی'' رکھا تھا اور دن بھر اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی چچا ''گھسیٹے خان'' کا قصہ اسے سناتے تھے۔ کبھی ''ماموتھو'' کا۔

ابوخاں نے یہ سوچ کر کہ یہ بکریاں شاید میرے تنگ آنگن میں گھبراتی ہیں، اپنی اس بکری چاندنی کے لیے نیا انتظام کیا تھا۔ گھر کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اس کے بیچ میں چاندنی کو باندھتے تھے۔ اور رسّی بہت لمبی رکھتے تھے کہ خوب ادھر ادھر گھوم سکے۔ اس طرح چاندنی کو ابوخاں کے یہاں خاصا زمانہ گزر گیا اور ابوخاں کو یقین ہو گیا کہ آخر ایک بکری تو ہل گئی، اب یہ نہ بھاگے گی۔

مگر ابوخاں دھوکے میں تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی آسانی سے دل سے نہیں مٹتی۔ پہاڑ اور جنگل میں رہنے والے آزاد جانوروں کا دم گھر کی چار

دیواری میں گھستا ہے تو کانٹوں سے گھرے ہوئے کھیت میں بھی انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ قید سب ایک سی۔ تھوڑے دن کی لیے چاہے دھیان بٹ جائے مگر پھر پہاڑ اور جنگل یاد آتا ہے اور قیدی اپنی رسّی تڑانے کی فکر کرتا۔ ابو خاں کا خیال ٹھیک نہ تھا کہ چاندنی پہاڑ کی ہوا بھول گئی ہے۔

ایک دن صبح صبح جب سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے ہی تھا کہ چاندنی نے پہاڑ کی طرف نظر کی۔ منہ جو جگالی کی وجہ سے چل رہا تھا رک گیا اور چاندنی نے دل میں کہا وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی حسین ہیں۔ وہاں کی ہوا اور یہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ۔ پھر وہاں اچھلنا کودنا اور ٹھوکریں کھانا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ گردن میں آٹھ پہر یہ کم بخت رسّی۔ ایسے گھروں میں گدھے اور خچر ہی بھلے چگ لیں ہم بکریوں کو تو ذرا بڑا میدان چاہیے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ چاندنی اب وہ پہلی سی چاندنی نہ تھی۔ نہ اسے ہری ہری گھاس اچھی لگتی تھی۔ نہ پانی مزہ دیتا تھا، نہ ابو خاں کی لمبی داستانیں بھاتی تھیں۔ روز بروز دبلی ہونے لگی۔ دودھ گھٹنے لگا۔ ہر وقت منہ پہاڑ کی طرف رہتا۔ رسّی کو کھینچتی اور عجیب دردبھری آواز سے ''میں میں'' چلاتی۔ ابو خاں سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو کوئی بات ضرور ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا؟

ایک دن صبح جب ابوخاں نے دودھ لیا تو چاندنی نے ان کی طرف منہ پھیرا اور اپنی بکریوں والی زبان میں کہا ''ابومیاں! اب میں تمھارے پاس رہوں گی تو مجھے بڑی بیماری ہو جائے گی مجھے تم پہاڑ ہی پر چلے جانے دو۔

ابوخاں، بکریوں کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ چلّا کر بولے ''یا اللہ! یہ بھی جانے کو کہتی ہے، یہ بھی!'' ہاتھ کے تھرتھرانے سے مٹی کی لٹیا جس میں دودھ دوہا تھا ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہوگئی۔

ابوخاں وہیں گھاس پر بکری کے پاس بیٹھ گئے اور نہایت غمگین آواز میں پوچھا کیوں بیٹی چاندنی! تو بھی مجھے چھوڑنا چاہتی ہے''۔

چاندنی نے جواب دیا ''ہاں ابومیاں، چاہتی تو ہوں'' ''ارے کیا تجھے چارہ نہیں ملتا، یا دانا پسند نہیں، بنیوں نی گھنے دانے ملا دیے ہیں؟ میں آج ہی اور دانے لے آؤں گا''۔

''نہیں، نہیں میاں! دانے کی کوئی تکلیف نہیں'' چاندنی نے جواب دیا۔

تو پھر کیا رسّی چھوٹی ہے؟ میں اور لمبی کر دوں؟''

چاندنی نے جواب دیا ''اس سے کیا فائدہ''؟

''تو آخر پھر بات کیا ہے؟ تو چاہتی کیا ہے؟'' چاندنی نے جواب دیا'' کچھ نہیں، بس مجھے پہاڑ پر جانے دو''

ابو خاں نی کہا ''اری کم بخت تجھے یہ خبر ہے کہ وہاں بھیڑیا رہتا ہے۔ جب وہ آئے گا تو کیا کرے گی؟''

چاندنی نے جواب دیا ''اللہ نے دو سینگ دیے ہیں۔ ان سے اسے ماروں گی''۔

''ہاں ہاں ضرور!'' ابو خاں بولے ''بھیڑیے پر تیرے سینگ ہی کا اثر ہوگا۔ وہ تو میری کئی بکریاں ہڑپ کر چکا ہے۔ ان کے سینگ تو تجھ سے بڑے تھے۔ تو کلّو کو جانتی نہیں۔ وہ پچھلے سال تھی۔ بکری کا ہے کو تھی، ہرن تھی۔ رات بھر سینگوں سے بھیڑیے کی ساتھ لڑی۔ مگر پھر صبح ہوتے ہوتے اس نے دبوچ ہی لیا اور کھا لیا''۔

چاندنی نے کہا ''ارے بے چاری کلّو! مگر خیر ابو میاں اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے پہاڑ پر جانے ہی دو''۔

ابو خاں کچھ جھنجھلائے اور بولے ''یا اللہ یہ بھی جاتی ہے۔ میری بکری اور اس کم بخت بھیڑیے کے پیٹ میں جائے گی! مگر نہیں نہیں، میں اسے ضرور بچاؤں گا۔ کم بخت احسان فراموش! تیری مرضی کے خلاف تجھے بچاؤں گا۔ اب تیرا ارادہ معلوم ہو گیا ہے۔ اچھا بس چل، تجھے کوٹھری میں باندھا کروں گا۔ نہیں تو موقع پا کر چل دے گی۔

ابو خاں نے چاندنی کو ایک کونے کی کوٹھری میں بند کر دیا اور اوپر سے زنجیر چڑھا دی۔ مگر غصّے اور جھنجھلاہٹ میں کوٹھری کی کھڑکی بند کرنا بھول گئے۔ ادھر انھوں نے کنڈی چڑھائی اور چاندنی کھڑکی میں سے یہ جا وہ جا۔

چاندنی پہاڑ پر پہنچی تو اس کی خوشی کا کیا پوچھنا تھا۔ پہاڑ پر پیڑ اس نے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن آج ان کا اور ہی رنگ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کھڑے ہوئے اسے مبارک باد دے رہے ہیں کہ پھر ہم میں آملی۔ ادھر ادھر سیوتی کے پھول مارے خوشی کے کِھل کِھل کر ہنس رہے تھے۔ کہیں اونچی اونچی گھاس اس سے گلے مل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا پہاڑ مارے خوشی کے مسکرا رہا ہے اور اپنی بچھڑی ہوئی بچی کے واپس آنے پر پھولا نہیں سماتا۔ چاندنی کی خوشی کا کیا حال بتائیں۔ نہ چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ، نہ کھونٹا، نہ رسّی اور نہ چارا۔ وہ جڑی بوٹیاں کہ ابو خان غریب اپنی ساری محبت اور پیار کے باوجود لا سکتے۔

چاندنی کبھی ادھر اچھلتی، کبھی ادھر۔ یہاں کودی وہاں پھاندی، کبھی چٹان میں، کبھی کھڈ میں۔ ادھر ذرا پھسلی، ادھر ذرا سنبھلی۔ ایک چاندنی کے آنے سے سارے پہاڑ پر رونق سی آگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابو خاں کی دس بارہ بکریاں چھوٹ کر یہاں آگئی ہیں۔

ایک دفعہ گھاس پر منہ مار کر اٹھایا تو، چاندنی کی نظر ابو خاں کے مکان اور اس کے کانٹوں والے باڑے پر پڑی۔ انھیں دیکھ کر خوب ہنسی اور کہنے لگی ''یا خدا! کوئی دیکھے تو کتنا ذرا سا مکان ہے اور کیسا چھوٹا سا باڑا۔ یا اللہ میں اس میں اتنے دن کیسے رہی؟ اس میں آخر سماتی کیسے تھی؟'' پہاڑ کی چوٹی پر سے اس ننھی سی جان کو نیچے کی ساری دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔

چاندنی کے لیے یہ دن بھی عجیب تھا۔ دوپہر تک اتنی اچھلی کودی کہ شاید ساری عمر میں اتنی نہ کودی ہوگی۔ دوپہر ڈھلے اسے پہاڑی بکریوں کا گلّہ دکھائی دیا گلّے کی بکریوں نے اسے خوشی خوشی اپنے پاس بلایا اور اس سے حال احوال پوچھا۔

چاندنی کو ابھی آزادی کی اتنی خواہش تھی کہ اس نے گلّے کے ساتھ ہو کر ابھی سے اپنے اوپر پابندیاں لینا گوارا نہ کیا اور ایک طرف چل دی۔ شام کا وقت ہوا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سارا پہاڑ لال سا ہوگیا۔ اور چاندنی نے

سوچا: اوہو! ابھی سے شام؟ نیچے ابو خاں کا گھر اور وہ کانٹوں والا باڑا، دونوں کُہر میں چھپ گئے۔ نیچے کوئی چرواہا اپنی بکریوں کو باڑے میں بند کرنے کے لیے جارہا تھا۔ ان کی گردن کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چاندنی اس آواز کو خوب پہچانتی تھی۔ اسے سن کر اداس سی ہوگئی۔ ہوتے ہوتے اندھیرا ہونے لگا اور پہاڑ میں سے ایک آواز آئی ''خو......و......خو''۔

یہ آواز سن کر چاندنی کو بھیڑیے کا خیال آیا۔ دن بھر ایک دفعہ بھی اس کا دھیان ادھر نہ گیا تھا پہاڑ کے نیچے سے ایک سیٹی اور ایک بگل کی آواز آئی۔ یہ بے چارے ابو خاں تھے۔ جو آخری کوشش کررہے تھے کہ اسے سن کر چاندنی بھی لوٹ آئے۔ ادھر یہ کہہ رہے تھے کہ ''لوٹ آؤ، لوٹ آؤ۔ ادھر سے دشمن جان بھیڑیے کی آواز آرہی تھی۔ چاندنی کے دل میں کچھ تو آئی کہ لوٹ چلیں۔ لیکن اسے کھونٹا یاد آیا۔ رسّی یاد آئی۔ کانٹوں کا گھر یاد آیا اور اس نے سوچا کہ اس زندگی سے یہاں کی موت اچھی ہے۔ آخر کو سیٹی اور بگل کی آواز بند ہوگئی۔ پیچھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ چاندنی نے مڑ کر دیکھا تو دو کان دکھائی دیے۔ سیدھے کھڑے ہوئے، اور دو آنکھیں جو اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ بھیڑیا سر پر پہنچ گیا تھا۔

بھیڑیا زمین پر بیٹھا تھا۔ نظر بے چاری بکری پر جمی تھی۔ اسے اطمینان تھا۔ جلدی نہ تھی۔ خوب جانتا تھا کہ اب کہاں جاتی ہے؟ بکری نے

جو اس کی طرف رُخ کیا تو یہ مسکرایا اور بولا ''اوہو! ابو خاں کی بکری ہے۔ خوب کھلا کھلا کر موٹا کیا ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی لال لال زبان نیلے نیلے ہونٹوں پر پھیری چاندنی کو کلّو کا قصہ یاد آیا جو ابو خاں نے سنایا تھا اور اس نے سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ رات بھر لڑ کر صبح جان دوں۔ ابھی کیوں نہ اپنے آپ کو سپرد کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں اپنا سر جھکایا۔ سینگ آگے کو کیے اور پینترا بدل کر بھیڑیے کے مقابل آئی کہ بہادروں کا یہی کام ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ چاندنی اپنی بساط نہ جانتی تھی اور بھیڑیے کی طاقت کا اسے اندازہ نہ تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ ضروری ہے۔ جی میں سوچتی کہ میں کلّو کی طرح رات بھر مقابلہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔

کچھ دیر جب گزر گئی تو بھیڑیا بڑھا۔ چاندنی نے بھی سینگ سنبھالے اور وہ حملے کیے ہیں کہ بھیڑیے کا جی جانتا ہوگا۔ بیسیوں مرتبہ اس نے بھیڑیے کو پیچھے ریل دیا ساری رات اسی میں گزری۔ کبھی کبھی چاندنی اوپر آسمان کی طرف اور ستاروں سی آنکھوں میں کہہ دیتی ''اے کاش اس طرح صبح ہو جائے''۔

ستارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ چاندنی نے آخری وقت میں اپنا زور دوگنا کر دیا۔ بھیڑیا بھی تنگ آ گیا تھا کہ دور سے

اسے روشنی سی دکھائی دی۔ نیچے بستی میں مسجد سے اذان کی آواز آئی چاندنی نے دل میں کہا ''اللہ! تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی۔ موذّن آخری مرتبہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا۔ چاندنی بے دم ہوکر زمین پر گر پڑی۔

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہورہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے۔ وہ مصر ہے کہ '' چاندنی جیتی''۔

I مختصر سوالات:

1) ابوخان کون تھے اور کہاں رہتے تھے؟

2) ابوخان کوکس چیز کا شوق تھا؟

3) ابوخان نے اپنی بکریوں کے کیا نام رکھے تھے؟

4) بکریاں رسّی تڑاکر کیوں چلی جاتی تھیں؟

5) اپنی بکری چاندنی کے لئے ابوخاں نے کیا نیا انتظام کیا؟

6) ابوخاں صبح جب دودھ دوہنے کے لئے گئے تو چاندنی نے کیا کہا؟

7) ابوخان نے جب چاندنی کو کوٹھری میں بند کیا تو اُس نے کیا کیا؟

8) چاندنی جب پہاڑ پر پہنچی تو اسے کیسا لگا؟

9) ابوخان کی سیٹی اور بگل کی آواز سن کر چاندنی نے کیا سوچا؟

10) چاندنی نے مسجد سے اذاں کی آواز سن کر دل میں کیا کہا؟

II توضیحی سوالات:

1) ابو خان کی بکریاں پہاڑی پر کیوں بھاگ جاتی تھیں

2) پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھ کر چاندنی کے دل میں کیا خیالات آئے اور اُس نے کیا کیا؟

3) چاندنی نے بھیڑیے کا مقابلہ کیا سوچ کر کیا؟

4) چاندنی اور بھیڑیے کی لڑائی اپنے الفاظ میں لکھیے؟

5) ابو خان کے کردار پر روشنی ڈالیئے؟

نام دیو مالی

مولوی عبدالحق

نام دیو مالی کا تعلق نچلی ذات سے تھا۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں ہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں قیس ہو، کوہ کن ہو یا حالی عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں۔ جس باغ میں وہ کام کرتا تھا وہ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کیا اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا، مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش کرتا۔ ان کو سرسبز و شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پوڈے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی ہر دوڑ جاتی تھی۔ کبھی کسی پودے کو اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگواتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا۔ جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی

اسے علاج کے لئے بلاتے۔ بلا تامل چلا جاتا مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہ لیتا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی چمن کو بھی رکھتا تھا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ باغ کے داروغہ عبدالرّحیم خاں خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ مالیوں کو اکثر ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے، ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے، لیکن نام دیو سے کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کی اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلّت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کر لانا شروع کیا۔ پانی

کیا تھا یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نی اس کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش گوار آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات کی سپرد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اسے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران اور بیسیوں مالی۔ اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فن باغبانی کی کہیں تعلیم پائی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا، البتہ کام کی دھن تھی، کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج رہا۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی۔ اس پر بھی اپنے غریب

بھائیوں کی مدد کرتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا، لیکن اسے کبھی خیال نہ آیا کہ بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لئے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا نیکی نیکی نہیں رہتی۔ جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے؟ بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔ تھا تو نچلی ذات کا، پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

I مختصر سوالات:

1) نام دیو مالی کس ذات کا آدمی تھا؟

2) نام دیو کی کون سی حرکتیں دیکھ کر مصنف کو تعجب ہوتا تھا؟

3) نام دیو کس کو اپنی اولاد سمجھتا تھا؟

4) نام دیو پودوں کی کس طرح سیوا کرتا تھا؟
5) نام دیو کو کس کے علاج کرنے میں مہارت تھی؟
6) نام دیو کا چمن ہرا بھرا کیوں تھا؟
7) نام دیو کس مزاج کا آدمی تھا؟
8) مصنف نام دیو کی طرف کیوں متوجہ ہوا؟

II توضیحی سوالات:

1) نام دیو کی لگائے ہوئے پودے کیوں ضائع نہیں ہوتے تھے؟
2) بچوں اور گاؤں والوں کی وہ کیا ضرورت پوری کرتا تھا؟
3) خشک سالی میں نام دیو نے اپنے باغ کو کیسے بچایا؟
4) نام دیو کو کبھی ڈانٹنے کی ضرورت کیوں نہ ہوتی تھی؟
5) نام دیو کے کردار پر روشنی ڈالئے؟

صلیب

ڈاکٹر عابد صفی

فسٹ کلاس ویٹنگ روم میں اس خاتون کے سوا اور کوئی نہ تھا!

میں نے اٹیچی نیچے رکھ کر گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے۔ گاڑی کے لئے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا ویٹنگ روم کے اندر بیٹھے بیٹھے ڈیڑھ گھنٹہ گذارنا میری بس کی بات نہ تھی۔ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ پلیٹ فارم پر چل کر گھوم پھر بھی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ دس ہی منٹ میں میرا دم گھٹنے لگا اور جس سے نکلنے کے لیے میرے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اس خاتون سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا جائے۔ اس طرح انتظار اور تنہائی کی گھڑیاں شاید ٹل جائیں۔ اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر میں نے ایک رسمی قسم کے سوال سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ پھر باتوں کا سلسلہ آگے بڑھا تو غیرت اور تکلف کی دیوار بھی آہستہ آہستہ گرتی چلی گئی اور پھر یہ ہوا کہ دس ہی منٹ کے اندر نہ صرف ہم نے ادھر ادھر کی ڈھیر ساری باتیں کر ڈالی تھیں بلکہ اس نے میری چائے بھی قبول کر لی تھی! لیکن ہم نے اب تک ایک دوسرے کی ذات سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جان سکا تھا کہ آیا وہ کنواری ہی ہے یا اس کی شادی ہو چکی ہے۔

چائے پیتے پیتے اچانک اس نے ہونٹوں سے پیالی ہٹالی۔

''میری حماقت تو دیکھئے کہ آپ کی چائے تو قبول کرلی لیکن نہ اپنے متعلق کچھ بتایا اور نہ آپ کے بارے میں کچھ پوچھا'' اس کی مترنم ہنسی کانوں میں رس گھول گئی۔''

''تو کیا ہوگیا۔ اب بھی اپنا تعارف پیش کرکے یہ حساب بے باق کرسکتی ہیں آپ!''

سرخی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر آئی اور گذر گئی۔ اس کے جھینپنے کا یہ انداز مجھے بڑا پیارا لگا۔ اتنے میں بیرا آگیا اور میں بل چکانے کے بعد پھر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''مجھے ثریا کہتے ہیں بمبئی میں رہتی ہوں وہیں میرے شوہر کی فونڈری ہے''۔ اس نے اپنا تعارف پیش کیا۔

''اور مجھے پرویز کہتے ہیں چینئی کا باشندہ ہوں''۔

''سچ! آپ چینئی کے ہیں؟ مجھے چینئی بہت پسند ہے''۔

''اس بات سے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرا وطن آپ کو بھی پسند ہے ورنہ آج کل تو ایک صوبہ کے لوگ دوسرے صوبے کا نام سن کر ہی نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں''۔

''وہ تو ہمارا تعصب اور ہماری تنگ نظری ہے جو ہمیں کہیں کا نہیں رکھے گی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں بھی چینیئی ہی کی رہنے والی ہوں''۔

''سچ''؟

''ہاں''!

اس مختصر سے جواب کے بعد وہ خاموش ہوگئی لیکن میرے اندر اس اطلاع سے خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ سفر میں یا وطن سے دور کسی ہم وطن کا مل جانا واقعی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

''پتہ نہیں اب چینیئی کا کیا حال ہے؟'' اس کے بجھے بجھے لہجہ پر میں چونک پڑا۔ ابھی ابھی تو وہ بڑی خوش نظر آئی تھی۔ اب اچانک اسے کیا ہوگیا تھا۔

چینیئی چھوڑے کافی دن تو نہیں ہو گئے آپ کو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے...... کتنے اچھے تھے وہ دن......'' جیسے جذبات اسے ماضی کی طرف ڈھکیلے جا رہے تھے۔ اس کے لہجے کی اداسی بڑھتی چلی گئی تھی چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ چلا تھا۔ وہ اسی طرح جملہ کو ادھورا چھوڑ کر ماضی کے اچھے دنوں میں شاید کھوگئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ چینیئی سے وابستہ وہ کونسی سہانی یادیں ہوں گی جنھوں نے یک لخت اسے اس قدر افسردہ

اور ہوش باختہ کر دیا تھا۔ اس کی شوخی اور چہرے کی شفق کو ایک ہی لمحے میں اس سے چھین لی تھیں۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے چلے گئے۔

''معلوم ہوتا ہی بہت ساری اچھی سی یادیں وابستہ ہیں آپ کی چینئی شہر سے!''

''جی ہاں ...... کس کا تعلیمی دور حسین نہیں ہوتا!''

''کہاں ہوی تھی آپ کی تعلیم؟''

''پریسی ڈنسی کالج میں''

''سچ! کیا سبجکٹ تھا آپ کا؟''

''انگریزی ادب میں پی۔جی کیا تھا''۔

''بڑی خوش قسمت نکلیں آپ تو......'' میں نے اس کی افسردگی کو دور کرنے کی سعی کی۔ پریسی ڈنسی کالج میں داخلہ ملنا اور پھر انگریزی ادب میں۔ بھلا کس کو ناز نہ ہوگا اس بات پر!

''ہاں! سچ کہا آپ نے۔ میں تو بھلا ہی نہ سکوں گی اس دور کو۔''

وہ پھر اپنے ماضی کے دلفریب سپنوں میں کھوتی نظر آئی۔

''کیا سوچنے لگیں آپ''۔

''جی !......بس کچھ نہیں ......آپ بھی اس کالج کے اسٹوڈنٹ رہ چکے ہیں کیا؟''

''یہ خوش قسمتی نہ ہو پائی لیکن میرا ایک گہرا دوست جاوید وہاں کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔''

جملے کے اختتام پر اچانک ہم دونوں ہی چونک پڑے میرے دماغ میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ ایک شک بجلی کی طرح لہرا گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بھلا کس سال ختم کیا تھا آپ نے ایم۔اے''

''دو سال پہلے''۔

''دو سال پہلے !.... پریسی ڈنسی ......انگریزی ادب ثریا''۔ تیزی سے میرا دماغ ان کڑیوں کو جوڑنے لگا۔

''آپ جاوید کو تو نہیں جانتیں ؟!''

میں نے ثریا کو ٹٹولا !

جی !ثریا کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جاوید کا نام دوبارہ سن کر وہ سٹپٹا سی گئی تھی۔

''ہاں جاوید کو...... جس نے دو سال پہلے پریسی ڈنسی سے ایم۔اے کیا تھا...... انگریزی ادب میں ہی!''

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ اس کے پورے جسم پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں پھاڑے بری طرح تکتی رہی اور پھر اس کی نگاہیں اپنی آپ جھکتی چلی گئیں اور میں سوچنے لگا۔ کیا یہ وہی ثریا ہے جس نے پیار تو جاوید سے کیا تھا۔ لیکن شادی بمبئی کے ایک فونڈری مالک سے رچالی۔ یہ آج دولت میں عیش کر رہی ہے اور وہ بیچارہ اس صدمہ سے پاگل بنا پھر رہا ہے۔ میری آنکھوں میں اس کے لئے نفرت اتر آئی۔ جو عورت کچھ ثانیوں پہلے معصومیت کی دیوی نظر آ رہی تھی اس نے اب ڈائن کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ اب میری نگاہوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگی تھی، مجھے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے آگے بیٹھنا گوارا نہ ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''سنئے!''

اس کی کانپتی ہوئی آواز پر میرے قدم رک گئے۔

''آپ چل پڑے؟''

''میں نے کچھ نہیں کہا صرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔

''آپ جاوید صاحب کے متعلق جانتے ہیں؟''

''ہاں سب کچھ اور......'' میں نے اس کی طرف دیکھا......''اور اب تو آپ کے متعلق بھی جان گیا ہوں بیچارے کو کیا پتہ کہ کس بے وفا کی یاد میں پاگل بنا مارا مارا پھر رہا ہے وہ اب کس مزے سے عیش کی داد دے رہی ہے!''

ایک لمحے تک خاموشی رہی۔ پھر وہ دھیمی سی آواز میں گویا ہوئی'۔

''آپ اس ملاقات کا حال جاوید صاحب کو نہ سنایئے گا۔ یہ میری عاجزانہ گذارش ہے آپ سے......''

اس کی آواز بھر آئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی ہیں لیکن میرے دل پر ان حربوں کا جادو نہ چل سکا۔ اور میں نے گویا دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوا۔

''اب آنسوؤں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جاوید کی زندگی میں زہر گھول کر جی نہیں بھرا تمہارا جو اب فونڈری کی مالک سے شادی رچا کر اس کی جان تلخ بنا رہی ہو۔ یقیناً تم ہرجائی ہو اور اب جبکہ تمہارا راز فاش ہو گیا ہے تو آنسو بہا کر مجھے ہموار کرنے کی کوشش کر رہی ہو......''

میں نے سگریٹ کو بوٹ تلے روندھ ڈالا اور اس کی بات کا کوئی

جواب دیئے بغیر باہر نکلنے کے لئے مڑا اور اسی وقت ایک جانے پہچانے چہرے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ میرے بڑے بھائی کے ایک دوست کا لڑکا تھا۔ بمبئی ہی میں اپنے والد کے ساتھ بزنس کر رہا تھا۔

اوہ! چاچا جان۔ آپ؟

''آداب عرض'' تم یہاں کیسے؟

''ارے! آپ نے انھیں نہیں پہچانا؟ اس نے ثریا کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا جو بالکل سراسیمگی کے عالم میں ہم دونوں کو تکتے جا رہی تھی''۔ یہ میری امّی جان ہیں!''

''کیا بک رہے ہو؟'' مجھے اپنی دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔

''لگتا ہے آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے چچا جان! ڈاڈی نے پچھلے سال شادی کر لی۔''

''اور تمہاری ماں؟''

''انہیں گذرے دو سال ہو گئے۔''

''تو یہ بات ہے!''

میں نے جلدی سے ثریا کی طرف دیکھا اور ثریا نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ دولت کی ہوس انسان کو کس قدر پیچ بنا دیتی ہے۔ دولت کے لئے ایک پچاس سالہ رنڈوے کو اپنا لیا! مجھے ثریا کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ ہوا۔ پھر میں جاوید کی معصوم محبت پر سوچتا سوچتا کھو سا گیا اور جب اس سوچ سے باہر نکلا تو مجھے اس لڑکے کی آواز سنائی دی۔

''مجھے ایک کال کرنی ہے چچا جان۔ میرے آنے تک آپ امی جان سے بات کیجئے گا۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور میں ثریا کی طرف توجہ کئے بغیر اٹیچی کیس اٹھا کر مڑ گیا۔

''سنیئے!''

اس کی آواز کی کپکپاہٹ پر میں چونک پڑا۔ میرے قدم یک بیک رک گئے۔ آواز کی تہہ میں یہ درد کیسا تھا؟!''۔

''خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ آپ جاوید صاحب کو اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔ اگر انہیں پتہ چلا کے میری قسمت نے

مجھے ایک عمر رسیدہ آدمی کی جھولی میں ڈال دیا ہے تو ان کا صدمہ دوگنا ہو جائے گا۔''

''خواہ مخواہ قسمت کو کیوں کوس رہی ہیں آپ''

''خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے۔'' آواز اس کے حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں مجھے محسوس ہوا جیسے آنسوؤں میں تیرتے ہوئے دو سرخ شعلے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

''عورت ذات کی محرویوں کا اندازہ آپ کر نہیں سکتے۔''

''میں سمجھ نہیں سکا آپ کی بات!

''آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ایک کنواری لڑکی کی لئے والدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی ایک ایک سانس؟ ان کی مسرتوں کا ایک ایک پل اس کے لئے کتنا قیمتی ہوتا ہے......''

''میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا کہ یہ عورت آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ اس لئے میں نے وضاحت طلب نگاہوں کے اس طرف دیکھا۔

''کوئی کنواری لڑکی اپنی وجہ سے اپنے والدین کے ماتھے پر

پریشانیوں کی لکیریں ابھرتے دیکھتی ہے تو تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ والدین کے ماتھے پریشانیوں کی لکیریں دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ان لکیروں کو مٹانے۔ ان کے ہونٹوں سے چھنی ہوئی مسکراہٹ واپس لے آنے کے لئے زندگی کیا ہے اگر اپنی جان کی بھینٹ بھی دینی پڑے تو وہ بخوشی صلیب پر چڑھ جائے گی۔''

''صلیب پر چڑھ جائے گی؟''

''ہے نا عجیب بے تکی بات!''

اس کے ہونٹوں پر ایک زیر خند ابھر آئی۔ پرویز صاحب آپ مرد ہیں اور مرد قیامت تک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ کس نے سمجھی ہے ہماری بے بسی جو آپ سمجھ جائیں گے۔ دنیا نے کسے چھوڑا ہے۔ حضرت مسیح تک کو نہیں بخشا۔ ہم تو پھر بھی عورتیں ہیں۔ بے بسی اور محرومیوں کی پُتلیاں جن کی قسمت کی ڈور سماج کی انگلیوں میں پھنسی رہتی ہے......۔

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ بحث سے کیا حاصل۔ میری تو آپ سے بس یہی بنتی ہے کہ آپ جاوید کی نظر میں مجھے بے وفا ہی رہنے دیں۔ یہ......آپ کا مجھ پر......بہت بڑا......احسان ہوگا۔''

سسکیوں کی تار نے اسے آگے کہنے نہ دیا اور اس نے اپنی آنکھوں

پر آنچل ڈال لیا۔ اور میری نگاہیں بھی آپ ہی آپ نم ہوتی چلی گئیں۔

اُف! میں نے کیا کیا سوچ ڈالا تھا اس مظلوم کے بارے میں، ندامت سے جیسے میں زمین میں دھنستا چلا گیا، کسی شاعرہ نے یہ مصرعے شاید اسی کے لئے کہے تھے۔

اسیر شام تنہائی میں یہ آخر گلہ کیسا

تجھے تو علم تھا زنجیر کا میری

جو پیروں میں بھی ہے

اور روح پر بھی

میں اپنے بخت کی قیدی ہوں!

ثریا تو سرتا پا بندھنوں کی قیدی تھی!

میں نے بہ وقت تمام ایک مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے کھسک آیا! ...... اس کے سوتیلے لڑکے کا انتظار کیے بغیر!!

I **مختصر سوالات:**

1) فسٹ کلاس ویٹنگ روم میں کون موجود تھے؟

2) وٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے فن کار کو کیا سوجھی ؟

3) پرویز نے خاتون سے گفتگو کا آغاز کس طرح کیا ؟

4) خاتون کا نام کیا تھا اور اس کے شوہر کہاں اور کیا کام کر رہے تھے ؟

5) ثریا کی تعلیم کہاں ہوئی اور اس کا سبجکٹ کیا تھا ؟

6) جاوید کا نام سن کر ثریا کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگیں ؟

7) پرویز نے جاوید کے متعلق کیا کہا اور جاوید کا نام سن کر ثریا نے کیا کہا ؟

8) پرویز کی مڈبھیڑ کس سے ہوئی اور وہ کون تھا ؟

9) لڑکے کا جواب سن کر پرویز کے دل میں ثریا سے متعلق کیا تاثر قائم ہوا ؟

10) خدا کا واسطہ دے کر ثریا نے پرویز سے کیا کہا ؟

II توضیحی سوالات:

1) پرویز کی ملاقات ثریا سے کہاں اور کس موضوع پر ہوئی ؟

2) ثریا کے کردار پر روشنی ڈالئے ؟

3) ثریا نے اپنی محرومیوں کی داستان پرویز کو کیوں سنائی ؟

4) پرویز پر اس داستان کا کیا اثر پڑا ؟

5) کہانی ''صلیب'' کا مرکزی خیال واضح کیجئے ؟

فقیر

عظیم بیگ چغتائی

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں غسل خانے سے نہا کر برآمدہ میں جو نکلا تو کسی فقیر نے سڑک پر سے کھڑکی کی چلمن میں شاید پرچھائیں یا جنبش دیکھ کر صدا دی، ''مائی تیرے بیٹا ہوئے'' درحال یہ کہ نہ تو یہاں کوئی مائی تھی اور نہ کسی کو یہ گھبراہٹ تھی کہ ایک عدد لڑکا خواہ مخواہ تولد ہوتا پھرے۔ دراصل یہ فقیر ان میں سے تھا جو مانگنا بھی نہیں جانتے۔ ذرا اس احمق سے کوئی یہ پوچھتا کہ بے وقوف یہ کون سی عقل مندی ہے کہ کسی سوراخ میں سے کوئی بھی ہلتی چیز دیکھ پائی اور بیٹا بیٹی تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ پھر مجھے فقیروں سے ویسے بھی بغض ہے۔ کیوں کہ جب کبھی مجھے کوئی فقیر ملتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں تو ایسا پاتا ہوں کہ مجھ سے دو کو کافی ہو۔ چنانچہ میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے چق اُٹھا کر اِس نیت سے دیکھا کہ اس سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ نوکری کرے گا؟

لیکن جب میں نے دیکھا تو ایک قابلِ رحم ہستی کو پایا۔ ایک فاقہ زدہ، ضعیف العمر چیتھڑے لگائے، بے کسی و بے بسی کی زندہ تصویر تھا۔ سچ ہے ان لوگوں کو مانگنا بھی نہیں آتا۔ نہ تو یہ کوئی عمدہ گیت جانتے ہیں، نہ کوئی لے جانتے ہیں، نہ صدا جانتے ہیں۔ بس پیسے لیے اور دانت نکال دیے۔ یہ دکھانے کو کہ

دیکھو ہم بھی اس دنیا میں رہتے ہیں اور یوں رہتے ہیں۔ مجھے اس کی حالتِ زار دیکھ کر بڑا رحم آیا اور میں نے اس سے کہا کہ گھوم کر صدر دروازے پر آ جایئے۔

صبح کا وقت تھا، میں چائے پینے لگا، اور گھر والی سے کہا کہ ایک انتہا سے زیادہ قابلِ رحم فقیر آیا ہے، اسے دو چار پیسے دے دو، اور صبح کا وقت ہے دو توس اور ایک پیالی چائے دے دو۔

جتنی مسٹنڈے فقیروں سے مجھے نفرت ہے اس سے دوگنی نفرت میری بیوی کو ہے اور اسی مناسبت سے ان فقیروں یعنی محتاجوں سے الفت ہے جو واقعی رحم و کرم کے مستحق ہیں۔

خانم نے فقیر کا نام سُن کر جلدی جلدی گرما گرم توسوں کو انگیٹھی پر سینک کر خوب مکھن لگایا اور ایک پیالی میں خوب بہت سا دودھ ڈال کر چائے بنا دی اور مزید برآں کچھ مٹھائی بھی رکھ دی، اور سینی میں چار پیسے رکھ دیے اور لڑکے سے کہا: ''فقیر کو صدر دروازہ سے اندر یعنی برآمدہ میں بٹھا کر کھلا دے''۔

اب قسمت تو ہماری ملاحظہ ہو کہ وہ غریب محتاج جسے میں نے بلایا، صدر دروازہ کی پشت پر تھا، گھوم کر آ جانا اس کے لیے مشکل ہوا، یا آتے میں کسی دوسرے سے مانگنے لگا ہوگا یا پھر اپنی راہ کھوٹی نہ کرنا چاہتا ہوگا۔ قصہ مختصر، وہ تو آیا نہیں اور اس کے بدلے پھاٹک میں ایک اور فقیر صاحب داخل ہوئے اور اپنی صدا لگانے بھی نہ پائے تھے کہ کتّے نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے پاس ایک موٹا

ڈنڈا تھا، اس کی دو چار ہاتھ نہ گھمانے پائے تھے کہ لڑکا ناشتہ لے کر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک فقیر صاحب گلے میں مالا ڈالے موٹا سا فقیرانہ ڈنڈا اور فقیرانہ لباس، گلے میں جھولی، ہاتھ میں چمٹا، تہبند باندھے موجود ہیں۔ اس نے کتّے کو ڈانٹا، اور کہا سائیں جی برآمدے میں آجاؤ۔ سائیں جی نے غنیمت سمجھا اور ناشتہ شروع کیا، اور ادھر میں نے خانم سے کہا کہ پرانا سوئیڑ اور ایک قمیص فقیر کو اور بھیج دو، سردی کا وقت ہے اور غریب مر رہا ہوگا جاڑے میں۔ خانم نے جلدی سے ایک قمیص اور سوئیٹر پرانا لیا اور لڑکے کو دیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا کہ فقیر کیا کہتا ہے؟ لڑکے نے کہا خوب دعائیں دے رہا ہے اور کھا رہا ہے۔ لڑکا قمیص اور سوئیٹر لے کر پہنچا اور وہ بھی فقیر صاحب کی زندگی کی نذر کیا۔ اتنے میں میں چائے پی کر باہر نکلا کہ فقیر کو گرم کپڑے پہنے ہوئے دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہوسکتی ہے، اس سے لطف اٹھاؤں۔

میں باہر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹا کٹا، انتہا سے زیادہ مضبوط فقیر ڈکاریں لے رہا ہے اور سوئیٹر اور قمیص ہزاروں دعاؤں کے ساتھ لپیٹ کر جھولی میں رکھ رہا ہے۔ دراصل یہ مسٹنڈا صرف ایک سینہ کھلی فقیروں والی کفنی پہنے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی سرد ہوا سے لطف اٹھا رہا ہے۔ سینہ اونچا، داڑھی منڈی ہوئی بلّے چڑھے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت لگے مجھے دعائیں دینے۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں، سارا کھایا پیا خون ہو گیا، جان سلگ کر رہ گئی۔ جی میں تو یہی آیا کہ اس کم بخت کا منہ نوچ لوں، ڈنڈا اور چمل اٹھا کر لگے حضرت دعائیں دے کر رخصت ہونے۔ دعاؤں میں مبالغہ اور غلو سے میری اور بھی جان جلی۔ اتنے میں خانم نے بھی جھانک کر دیکھا، وہاں بھی یہی حال ہوا۔ اب بتایئے کیا کیا جا سکتا تھا؟ یہ ناممکن تھا کہ میں ان حضرت کو اس طرح ستم توڑ کر چلا جانے دوں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرے ایک دوست بھی آ گئے۔ میں نے دو لفظوں میں فقیر کی ستم آرائی بیان کی اور پھر فقیر سے کہا: ''تمھیں شرم نہیں آتی ......؟''

سادہ لوحی تو دیکھیے کہ یہ حضرت اس ریمارک کو سن کر اپنی تہمد کی طرف متوجہ ہو کر محض میری جان حزیں پر کرم گستری کے خیال سے ذرا نیچے کر لیتے ہیں۔ ''کم بخت!'' میں نے اور بھی جل کر کہا، ''اتنی موٹے تگڑے ہو کر بھیک مانگتے ہو، بڑے شرم کی بات ہے۔''

اس کے جواب میں فقیر صاحب نے اپنے پیدائشی حقوق کا اعادہ کرتے ہوئے ان سے دست برداری سے معذوری ظاہر کی، اور اب میں یہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس بدتمیز سے کم از کم سوئیٹر اور قمیص ہی چھین لی جائے۔ میرے دوست نے کہا، یہ مناسب نہیں ہے مگر حضرت وہ جو کسی نے کہا ہے۔

درد اس سے پوچھیے، جس کے جگر میں ٹیس ہو۔

میں نے کہا کہ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، میں اس موذی کو یہ چیزیں ہرگز ہضم نہ کرنے دوں گا۔ میں نے اب اس محتاج کی تلاش کرائی، ملازم اسے تلاش کرنے گیا، اور میں نے ادھر فقیر صاحب کو لیا آڑے ہاتھوں۔ میں نے کہا: ''تم نوکری کیوں نہیں کرتے؟''

وہ کچھ جل کر بولا، ''آپ ہی رکھ لیجیے۔''

میں نے فوراً رضا مندی ظاہر کی اور دس روپیہ ماہ وار اور کھانا تجویز کیا۔ فقیر صاحب اس کے جواب میں بولے: ''اور گھر والوں کو زہر دے دوں؟''

میں نے کہا'' کیوں؟''

وہ بولا، ''آپ دس روپیہ دیتے ہیں، ڈھائی آنہ روز کا تو گائے رزقہ کھاتی ہے، اور ایک بیوی تین بچے، پانچ روپیہ میں گزر کیسے ہو؟

''گائے بھی ہے تمھارے پاس؟'' میں متعجب ہو کر کہا۔

وہ بولا، ''صاحب آپ بڑے آدمی ہیں، ہم بھلا کہاں سے پیسہ لائیں جو روز تین سیر دودھ خریدیں؟''

''تین سیر؟'' میں نے متعجب ہو کر کہا۔ ''تین سیر! بھئی تین سیر کا خرچ کیسا؟'' معلوم ہوا، خیر سے خود حضرت دو سیر دودھ یومیہ نوش کرتے

ہیں۔ میں پھر تنخواہ کے سوال پر آیا تو عسرت کی شکایت کرتے ہوئے تیس روپیہ ماہ وار کا خرچ گھر کا بتایا اور قائل ہو کر کہا کہ اگر کم و بیش کسی روزگار میں اتنی کمائی ہو جائے کہ تنگی تُرشی سے بھی گھر کا خرچ چل جائے، تو فقیری چھوڑنے کو ابھی ابھی تیار ہیں۔

اب میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں، اور وہ میری طرف۔ پھر معلوم ہوا کہ حضرت دوپہر کی قیلولہ کے سخت عادی ہیں، اور کسی صورت میں بھی دوپہر میں تو کام کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے ہر طرح کوئی پیشہ، دھندا، نوکری، غرض جو بھی بتاؤ اس کے لیے حاضر ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے۔ میں اس موذی کو کیا جواب دیتا۔ میرا وہ حال کہ مرے پر سو دُرّے۔ اتنے میں ملازم آیا۔ باوجود سخت تلاش کے وہ محتاج نہ ملا۔ اگر میرے دوست نہ ہوتے تو غالباً میں اس موذی سے ضرور کپڑے چھین لیتا۔ مگر میں نے اور ترکیب سوچی۔

میں نے قطعی طور پر فقیر صاحب سے کہا کہ میں تمھیں اس حرام خوری کی سزا دیے بغیر ہرگز نہ جانے دوں گا۔ پچاس دفعہ کان پکڑ کر اٹھو بیٹھو، اور خبردار جو پھر کبھی اس طرف رخ کیا۔

فقیر نے غصّے کے شعلے میری آنکھوں میں دیکھے۔ ممکن ہے کہ یہی سوچا ہو کہ سوئیٹر اور قمیص دونوں بالکل ثابت ہیں، سودا پھر بھی برا نہیں، نہایت ہی خاموشی اور سادگی سے آپ نے ڈنڈا اور پیالہ اپنا ایک طرف رکھا، جھولی

اور مالا اتار کر رکھا اور تہمد اونچی کر کے کہنے لگا کہ میں نے ڈانٹا ''بدتمیز!'' اس کے جواب میں وہ مجھے نہایت ہی مطمئن کر کے فرماتے ہیں، ''نیچے جانگیا پہنے ہوں'' اور مخل ہو گی۔

لیکن میں چوں کہ سزا دینا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے اس کی بھی اجازت دے دی اب یہ حضرت ایک ہُنکار کے ساتھ بڑے زور سے ہونہہ کر کے بغیر پکڑے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک سپاٹے کے ساتھ پاؤں سرکا کر بیٹھک لگا گئے۔

''بدتمیز، بے ہودہ'' میں نے جل کر کہا، یاد رکھو، تمھیں پولیس کو دے دوں گا۔ کان پکڑ کر سیدھی طرح اُٹھو بیٹھو۔'' دو دفعہ ان کو میں نے کان پکڑوا کر اُٹھنا بیٹھنا بتایا اور یہ حضرت سزا بھگتنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ حضرت میری پُشت کی طرف تھے اور ہم دونوں دوست فقیروں کو بُرا بھلا کہنے میں مشغول ہوئے۔

ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ''کان پکڑی'' غالباً پچاس دفعہ ہو چکی۔ مڑ کر میں نے دیکھا، تو سُرعت کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ بولا کہ ایک سو دس دفعہ کی۔ میں نے کہا، ''بس! اب جاؤ! میں نے تو پچاس دفعہ کو کہا تھا، زیادہ کیوں کی؟''

وہ بولا، ''صاحب! پانچ سو بیٹھکیں روز لگاتا ہوں، میں نے سوچا

کہ اب بار بار کون کرتا پھرے، لاؤ یہیں پوری کر لوں۔''

''ارے'' میں نے اس کم بخت کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''کیا تو پہلوانی کرتا ہے۔'' واللہ میں نے گویا اب اس کو غور سے دیکھا۔ کان ٹوٹے ہوئے، سینہ اور شانہ اور پٹیں! خوب کسرتی بدن۔

خواب دیتے ہیں، ''ویسے نہیں کہتا، شہر کے جس پٹھے سے جی چاہے لڑا لیجیے''

میں نے کہا، ''کم بخت جی میں تو ہی آتا ہی کہ تیرا اور اپنا مر ملا کر لڑا لوں۔''

''نکل یہاں سے ابھی نکل ...... نکالو اِسے۔''

جلدی جلدی اُس نے اپنی جھولی وغیرہ اُٹھائی اور سیکڑوں دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا اور کم بخت مجھے انتہا سے زیادہ پست اور شکست خوردہ حالت میں چھوڑ گیا۔

اِس موذی کا بخار میں نے اور فقیروں پر نکالا، کسی کو نہ دیا، ڈانٹ کر بھگا دیا کہ ایک عرصہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑے مُلازمہ سے بحث فرما رہے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ جاؤ آگے بڑھو، اور آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اِس گھر سے

ہمیشہ ملتا ہے۔ (لفظ) ہمیشہ پر زور، اِدھر میں جو آیا تو فوراً مجھے اِس امر کی شہادت میں پیش کرتے ہیں اور ٹیپ کا بند ''اللہ بھلا کرے، کچھ سائیں کو بھی۔''

میں نے اُسے پکڑ لیا کہ آج تجھے نہ چھوڑوں گا۔ صحیح عرض کرتا ہوں کہ اِس موذی سے کوئی من بھر لکڑیاں پھڑوائیں، چشم زدن میں پھاڑ پھوڑ کر برابر کیں اور میری کرسی کے پاس آکر میرے پیر دابنا شروع کر دئے۔ اور کہا ''اللہ بھلا کرے۔''

''ارے کم بخت چھوڑ!'' میں نے بے تاب ہو کر کہا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری کوئی پنڈلیاں کوئی لوہے کے شکنجے میں دھر کے داب رہا ہے۔

لکڑیوں کی پھڑوائی کے شاید دو آنے دیے۔ قمیص اور مانگنے لگا۔ وہ نہ دی تو بدمعاش کہتا ہے۔ ''بھوکا ہوں''۔

I مختصر سوالات:

1) مصنف کو فقیروں سے کیوں بغض ہے؟

2) فقیر نے چلمن میں پرچھائیں دیکھ کر کیا صدا لگائی تھی؟

3) چائے پیتے ہوئے مصنف نے اپنے گھر والی سے کیا کہا؟

4) خانم نے فقیر کا نام سن کر کیا کہا؟

5) ناشتہ کے بعد فقیر کو کیا چیزیں پیش کی گئیں؟

6) فقیر کا حلیہ دیکھ کر مصنف کے دل پر کیا گذری ؟

7) مصنف نے فقیر کو سزا کیوں دی ؟

II توضیحی سوالات:

1) مصنف نے گداگری کی سماجی لعنت کو کس طرح واضح کیا ہے؟ تفصیل کے ساتھ لکھئے۔

2) فقیروں کی حالت کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا گیا ہے؟

3) اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے ؟

ارمانوں کی نگری

اے- امیر النساء

ترانہ کے لئے اچھے رشتوں کی کمی نہیں تھی چونکہ وہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی تھی ایک اچھے گھر کی بہو بن سکتی تھی۔ لوگ روپے پیسے کے لالچ میں نہ سہی سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی کی تلاش میں اس گھر کا رُخ کرتے تھے، مگر ترانہ کے والدین کی نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں تھا، وہ لوگ کوئی نہ کوئی نقص نکال کر اچھے سے اچھا رشتہ مسترد کر دیتے تھے۔ ترانہ ایک فرمانبردار مشرقی لڑکی تھی۔ وہ ماں باپ کے خلاف جا بھی کیسے سکتی ہے۔ جب کہ اس کی ساری سکھی سہیلیاں پیا کے دیس سدھار چکی تھیں، ترانہ کا اب تک کوئی بر نہ جڑا تھا شاید وہ کلیاں شاخوں پر ابھی پھوٹی ہی نہیں تھیں کہ جن سے ترانہ کے سہرے کے پھول گوندھے جاتے یا اس کا حجلۂ عروسی سجایا جاتا۔ حالانکہ ساری تیاریاں مکمل تھیں، زیور خریدے جا چکے تھے، جہیز مکمل ہو چکا تھا کپڑے بھی تقریباً تیار ہو چکے تھے۔ مگر وہی نہ آیا تھا جس کی لئے ساری تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ترانہ کے تصور کو اب تک کوئی تصویر نہیں ملی تھی جس سے وہ اپنے خوابوں کا نگر بساتی۔ اس کے تصور کا محور تو کوئی بنا ہی نہیں تھا کہ اس کے خیالوں سے اپنی تنہائیاں آباد کرتی۔ ماہ و سال یونہی گزرے چلے جا رہے تھے روکھے پھیکے سے، نہ کوئی رنگینی نہ کوئی دلکشی۔

ترانہ بڑی ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ اپنی حال میں مگن رہنے والی، اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ اپنی روزمرہ کی روٹین میں مصروف زندگی گزارتی چلی جارہی تھی۔ اچانک خوشیوں کی بارات نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دینا شروع کیا۔ پہلے تو وہ چونکی، پھر آہستگی سے دروازہ نیم وا کیا۔ چمکیلے سورج کی روشن روشن کرنین دل کی تاریکیوں کو منور کرنے کی اجازت مانگ رہی تھیں، نئی صبح کا اس نے خوش دلی سے استقبال کیا کہ یہ اس کی غیر دلکش زندگی کا تقاضا بھی تھا اور بے مقصد زندگی کا مقصد بھی۔ ایک خوشگوار سی لہر دل کے نہاں خانوں میں ہلچل مچانے لگی۔ ایک نامعلوم سی مسرت رگ رگ میں سرایت کرنے لگی۔ شاید اس انجانی خوشی کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ آج صبح صبح ناشتہ کے دوران ترانہ کی ابا نے اس کی امی کو ایک خوش کن اطلاع دی کہ میں نے ترانہ کا رشتہ طے کر دیا ہی۔ حالانکہ کئی دنوں سے یہ رشتہ زیر غور تھا، لڑکا اسی شہر سے تھا۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا، روپئے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، لڑکا پڑھا لکھا اور خوبصورت تھا۔ اپنی ہی برادری کا تھا اور سب سے بڑی بات دیکھا بھالا خاندان تھا۔ لڑکا اکلوتا تھا، اس کے ساتھ کوئی بکھیڑا بھی نہیں تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد منظوری کی اطلاع دے دی گئی، جس کی خبر بڑے خوش کن پیرائے میں ترانہ کے ابا اپنی بیوی کو دے رہے تھے۔ ترانہ کی سماعتوں نے وہ مژدۂ جانفزا سنا جس کی امید کئی دنوں سے دم توڑ چکی تھی۔ تبھی اس کی دل کے کورے کاغذ نے کنعان کا نام چمکیلی روشنائی سے لکھ لیا۔ اور اس کے تصور کے فریم میں جو عرصہ سے خالی تھا کنعان کی تصویر

سجالی اور اس کے خیالوں کا جہاں آباد ہو گیا۔ اب اس کی تنہائیاں کنعان کے تصور سے آباد رہنے لگیں۔ وہی زندگی تھی وہی صبح شام مگر اتنی دلکشی اس سے پہلے نہیں محسوس ہوئی تھی۔ سچ ہے خوشی کا تعلق ہمارے دل کی اندرونی کیفیات سے ہوتا ہے۔ جب دل کا موسم خوشگوار ہوتا ہے تو ہمارے آس پاس خوشیاں ہی خوشیاں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ ہوائیں گنگنانے لگتی ہیں، کلیاں چٹک کر پھول بنتی ہیں اور بہاروں کے قافلے وقفہ وقفہ سے اترنے لگتے ہیں۔ انھیں خوشگوار ساعتوں میں شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف سے بھرپور تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر کو رنگ و روغن سے سجایا گیا۔ پرانے پردوں کی جگہ نئے اور خوبصورت پردے لگوائے گئے۔ ممکن حد تک تبدیلی کے ساتھ گھر کو ایک نیا گٹ اپ دیا گیا۔ دولہا دلہن سے پہلے دونوں کے گھر دولہا دلہن کی طرح سج گئے۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے، خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی جیسے بہار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آئی ہو۔ خوشبوؤں کا طوفان تھا کہ امنڈ گھمنڈ کے چلا آ رہا تھا۔ گھر کا ذرہ ذرہ اپنی نئی آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ترانہ کے دل کی دھڑکنیں کنعان کا نام لے کر چھیڑ رہی تھیں۔ کنعان کی شبیہہ جب جب اس کی آنکھوں میں لہرا کر غائب ہو جاتی اس کے نازک سے لبوں پر بے اختیار کوئی شعر چھلک پڑتا:

ابھی آئے تصور میں ابھی جاتے ہو کیا معنی
یہ بے پوچھے چلا جانا کہیں شیوہ ہے مہمان کا

وقت کی صبحیں شام بن بن کر ڈھلتی رہیں اور شادی کی مقررہ تاریخ سر پر آ گئی۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ دلہن کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ زرد کپڑوں میں ترانہ کی سنہری رنگت سونا اگل رہی تھی۔ ابٹن اور مہندی کی ہلکی ہلکی خوشبوئیں ترانہ سے ہولے ہولے سرگوشیاں کرنے لگی تھیں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں گھر بھر میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ موتیاں اور جوہی کی مہک نے ماحول کو رومان پرور بنا دیا تھا۔ ترانہ اپنا سر گھٹنوں میں ٹکائے آنے والی پر بہار ساعتوں کو تصور کا چشمہ لگا کر دیکھ رہی تھی، جہاں اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کی زندگی کے ساتھی کے روپ میں آ چکا تھا۔ سنہری زرتار صافہ باندھے، ریشمی شیروانی زیب تن کئے، گلے میں نازک سے خوشبودار پھولوں کی مالا پہنے اس کی خوبصورت حنائی ہاتھوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہا تھا، ایک خوشگوار زندگی کی ضمانت دینے کے لئے اس کا ہاتھ ہمیشہ کے لئے تھامنے کے عہد کے ساتھ۔ ابھی وہ اپنے شریک سفر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام بھی نہیں پائی تھی کہ ہوا کی دوش پر ایک دلدوز چیخ سنائی دی کہ کنعان ایک جان لیوا حادثے میں مارا گیا۔ اپنے خوابوں کے شیش محل سے نکلی تو حقیقت کے سنگلاخ پتھروں نے ایسا زخمی کیا کہ وہ اپنا کرچی کرچی وجود لئے بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو اس کے ارمانوں کی نگری لٹ چکی تھی۔ اس کے خوابوں کا سجا سجایا محل پل بھر میں مسمار ہو چکا تھا۔ جسے مسند نوشہی پر بیٹھنا تھا پل بھر میں وہ مٹی کے ڈھیر میں جا سویا تھا۔ ترانہ پتھر کی مورتی کی

طرح بے حس ہو چکی تھی۔ سب نے ہلایا جلایا وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ پتھرائی آنکھوں سے ایک ایک چہرے کو دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کیا سچ مچ یہ جانکاہ حادثہ ہو چکا ہے؟ کیا سچ مچ میرے خوابوں کا نگر برباد ہو چکا ہے؟ تبھی اس کی امی نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی موم ہو گیا۔ اب ترانہ کے منجمد آنسوؤں کو بھی راستہ مل گیا۔ ایسے بلک بلک کر روئی کہ ماحول میں سکتہ سا طاری ہو گیا۔ تبھی ایک بزرگ خاتون نے ترانہ کو خود سے لپٹا کر دلاسا دیا۔ تیرا دکھ صحیح ہے میری بچی میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں کہ تیرے دکھ کو بانٹ سکوں۔ مگر یہ سوچ کر دل کو ڈھارس بندھتی ہے کہ نکاح کی وہ مقدس بول بولے ہی نہیں گئے کہ تیرا اس سے رشتہ جڑتا۔ تو نے تو سرخ جوڑا پہنا ہی نہیں کہ تو سہاگن بنتی، جانے والے نے تجھ پہ یہ احسان کیا کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا کہ وہ اس راستہ کا مسافر نہیں تھا۔ تیری منزل تو بہت قریب ہے بیٹی بس ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ بس دو قدم بڑھانے کی دیر ہے خوشیوں بھری منزل تیرا انتظار کر رہی ہے، تیرا غم اس غم نصیب ماں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جس کا شجر سایہ دار پل بھر میں خزاں کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں کھڑی اس کی چھاؤں کو ترس رہی ہے جو اسے کبھی نہیں ملے گی۔

I. مختصر سوالات:

1) ترانہ کس قسم کی لڑکی تھی؟

2) لوگ کس نیت سے ترانہ کے گھر کا رُخ کرتے تھے؟

3) ترانہ کے والدین اچھے سے اچھا رشتہ کیوں مسترد کر دیتے تھے؟

4) ترانہ کے والد نے اس کا رشتہ کہاں طے کیا اور وہ خاندان کیسا تھا؟

5) ترانہ نے رشتہ کا مژدہ سن کر کیا کیا؟

6) جب دل کا موسم خوش گوار ہوتا ہے تو کیا نظر آتا ہے؟

7) کن ساعتوں میں شادی کی تاریخ مقرر کی گئی؟

8) شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی دونوں طرف تیاریاں کیسے ہونے لگیں؟

II توضیحی سوالات:

1) ترانہ اور اسکے والدین سے متعلق اظہارِ خیال کیجئے۔

2) ترانہ کی شادی کے لئے والدین نے کیا کیا؟

3) ''ارمانوں کی نگری'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے۔

ڈھوپ چھاؤں

ڈاکٹر اعظم کریوی

قریباً تین سو برس پہلے کی بات ہے بھارت مغلوں کا وطن بن چکا تھا۔ ہندو مسلمان شیر و شکر کی طرح گھل مل چکے تھے۔ گھی، دودھ کی کمی نہ تھی۔ اناج سستا تھا۔ بھوک سے مرنا کوئی جانتا نہ تھا۔ ۱۶۱۷ء کا ذکر ہے شہزادہ شاہجہاں نے بیجاپور پر فوج کشی کی تھی۔ خود شہنشاہ جہانگیر مدد کے لئے دکن میں موجود تھا اور اس کا لشکر مانڈوگڈھ میں چھاؤنی ڈالے پڑا تھا تاکہ ضرورت کے وقت شاہجہاں کو آسانی سے مدد پہونچائی جا سکے۔

شہنشاہ جہانگیر کی فرصت کا وقت شکار میں گذرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے وہ شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے جُدا ہوکر جنگل میں راستہ بھول گیا۔ پیاس کے مارے اُس کا بُرا حال ہوگیا۔ وہ حیران و پریشان اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ دور سے اُسے ایک مکان نظر آیا۔ سُنسان جنگل میں مکان دیکھ کر جہانگیر کو بہت حیرت ہوئی لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اس کی جان میں جان آئی اور اس نے اپنا گھوڑا اُسی طرف بڑھا دیا۔ دوپہر کا وقت

تھا۔ سخت گرمی کی وجہ سے جنگل کمہار کا آوا بنا ہوا تھا۔ جہانگیر کا چہرہ تمازت آفتاب سے مُرجھا گیا تھا! مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پیاس کے مارے گلا خشک ہو گیا تھا۔ جب وہ اس مکان کے قریب پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک خوشنما چبوترہ ہے اور اس پر ''بن دیوی'' کی طرح ایک پندرہ سولہ برس کی کُماری بیٹھی ہے۔ متانت اور بھولے پن کے چہرہ کو دل فریب بنا دیا تھا۔ کپڑے میلے کچیلے پہنے تھی۔ گو بادل میں چاند یا مٹی میں ہیرا پوشیدہ تھا۔

جہانگیر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کماری نے لاج و شرم سے سر جُھکا لیا۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے جس پر عورت ذات فخر کر سکتی ہے۔ شرم و حیا کے سامنے عورت کے لئے تمام دُنیا کی خوبیاں ہیچ ہیں۔ شہنشاہ نے ایک معمولی آدمی کی طرح کماری کے سامنے پہونچ کر آہستہ سے کہا:

''سندری! میں ایک غریب مسافر ہوں۔ اس گھنے جنگل میں راستہ بھول کر آ گیا ہوں۔ پیاس کی شدّت سے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔ مہربانی کر کے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔''

کماری نے سادگی سے جہانگیر کی طرف دیکھ کر نرمی سے کہا:

''مسافر گھوڑے سے اُتر کر سایہ میں آ جاؤ۔ میں بھی پانی لاتی ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ مکان کے اندر چلی گئی۔ جہانگیر گھوڑے سے اُترا اور اسے ایک درخت سے باندھ کر خود چبوترہ پر بیٹھ گیا۔ اس عرصہ میں کماری ایک لوٹے میں ٹھنڈا پانی اور ایک چھوٹی سی تھالی میں جو کی دو روٹیاں اور کچھ ساگ لے آئی۔ بے تکلفی اور سادگی کا کتنا دلفریب منظر تھا۔ بھولی بھالی کماری نے گل افشانی کی:

''مسافر مُنھ ہاتھ دھو کر پہلے کچھ روٹی کھا کر پانی پی لو۔ خالی پیٹ پانی پینے سے نقصان ہوگا۔''

''مہمان نواز لڑکی! سادگی کی تصویر! بھارت کی مایۂ ناز کماری شاباش!''

سحر زدہ کی طرح جہانگیر نے کماری کا کہنا مان لیا۔ ان سوکھی روٹیوں اور ساگ پات میں شہنشاہِ ہند کو وہ مزہ ملا جو اسے تمام عمر شاہی کھانوں میں بھی نہ نصیب ہوا تھا۔ کھانا کھا کر شہنشاہ نے کماری کا بہت شکریہ ادا کیا۔

جب شہنشاہ کھانا کھا رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ کماری اُسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ جس وقت شہنشاہ کی نظر اس پر پڑتی تو وہ شرم سے اپنا سر

جُھکا لیتی۔ لیکن موقع پاتے ہی وہ پھر دیکھنے لگتی۔ اسی طرح تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ اس دیکھا دیکھی میں اچانک کماری کی نظر شہنشاہ کی انگلی میں پہنی ہوئی سُرخ یاقوت کی انگوٹھی پر پڑی۔ کماری کا چہرہ خوشی کے مارے کِھل اُٹھا۔ وہ دوڑ کر گھر کے اندر گئی اور وہاں سے کاغذوں کا ایک بستہ لے آئی۔ اس میں سے ایک سادہ کاغذ نکال کر کماری نے ایک ''لگن کنڈلی'' بنائی۔ شہنشاہ کھانا کھا چکا تو اُس نے کُنڈلی پر نظر ڈالی۔ وہ خود بھی علمِ جوتش سے واقف تھا۔ لڑکی کی ذہانت پر وہ دل ہی دل میں تعریف کرنے لگا۔ وہ کبھی حیرت سے اُس سنسان جنگل کی طرف دیکھتا، مکان کی آرائش پر نظر ڈالتا اور کبھی اس بھولی اور کمسن بن دیوی کو دیکھنے لگتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی شہنشاہ کی حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کنڈلی (زائچہ) تیار ہوگئی۔ شہنشاہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ اس کو جنم کنڈلی تھی جس پر خوشنما حرفوں میں ''شہنشاہ جہانگیر'' لکھا ہوا تھا۔

کنڈلی بنا کر کماری نے شہنشاہ سے استدعا کی (اب اس نے ''تم'' کی بجائے ''آپ'' سے مخاطب کیا):

''کیا آپ مجھے اپنا داہنا ہاتھ دیکھنے کی اجازت دیں گے؟''

شہنشاہ نے بڑی خوشی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ کماری تھوڑی دیر

تک ہاتھ کی ریکھائیں دیکھتی رہی۔ پھر بستہ سے ایک کاغذ نکالا جس پر پہلے کا تیار کیا ہوا ہاتھ کا بنا ہوا نقشہ تھا۔ اُس کو دیکھنے کے بعد کماری نے گھر کی طرف مُنہ کر کے کسی کو پکارا۔ تھوڑی دیر میں ایک ضعیفہ گھر سے نکلی۔ اس کی نورانی شکل دیکھ کر احترام اور عقیدت سے شہنشاہ نے سلام کیا۔ بن باسی ضعیفہ نے شہنشاہ کو آشیرواد دیا اور کماری سے کہا: ''کیا ہے بیٹی؟''

کماری نے قریب پہونچ کر آہستہ سے کہا:

> ''جن کے متعلق پتاجی پیشنگوئی کر گئے تھے، جن سے ملنے کا ارمان دل میں رکھ کر پتاجی سرگباش ہو گئے انہیں کو میں آج پاگئی۔ تمام نشانیاں وہی ہیں جو پتاجی بتا گئے تھے۔ پتاجی مجھ کو ایک مُہر کیا ہوا بند لفافہ دے گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ یہاں ضرور آئیں گے۔ لیکن میری قسمت میں اُن کی زیارت نہیں لکھی۔ جب وہ آئیں اور بتائی ہوئی نشانیاں اُن میں مل جائیں تو یہ لفافہ اُن کو دینا اور اُن کی خوب خاطر تواضع کرنا۔ وہ تمھاری سرپرستی اور حفاظت کریں گے۔''

شہنشاہ جہانگیر نے بھی کماری کی یہ باتیں سُنیں۔ حیرت اور استعجاب سے اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

یہ باتیں سُن کر ضعیفہ نے جہانگیر کی طرف دیکھ کر پوچھا:

''مسافر تم کون ہو؟ کس دیس کے رہنے والے ہو اور یہاں کس طرح سے آگئے؟''

اس وقت جہانگیر خدا جانے کس مصلحت سے خود کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

''ماں! میں شمالی ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ شہنشاہ جہانگیر کی فوج کا ایک معمولی سوار ہوں۔ شہنشاہ سلامت آج جنگل میں شکار کھیلنے آئے ہیں۔ میں انہیں کے ہمراہ تھا۔ اتفاق سے راستہ بھول کر اس طرف آگیا ہوں۔ تمہاری اس رحم دل بیٹی نے بھوک پیاس میں میری مدد کی۔ میں زندگی بھر اس احسان کو نہ بھولوں گا۔''

یہ سن کر کماری مسکرائی اور کہا:

''معاف کیجئے گا مسافر جی! اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے اپنا اصلی پتہ نہیں بتایا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے پتا جی کی پیشنگوئی غلط نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ جو وہ نشان بتا گئے ہیں وہ میں سب آپ میں پاتی ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کے آنے کا وہی وقت ہے جو پتا جی نے بتایا تھا۔ اس کے

علاوہ میرا علم مجھے بتاتا ہے کہ جیسی ریکھائیں آپ کے
ہاتھوں میں ہیں کسی معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں نہیں
ہوتیں۔ آپ کے ہاتھوں کی ریکھائیں بتاتی ہیں کہ آپ تو
راجوں کے راجہ ہیں۔''

یہ سُن کر جہانگیر دل ہی دل میں ہنسا اور لڑکی کی ذہانت کی تعریف
کی۔ لیکن بظاہر اس نے کہا:

''بیٹی! تم کو نہ جانے کیوں میری باتوں کا یقین
نہیں آتا۔ حالانکہ میں نے اپنا ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ خیر
اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور ایسے غیر آباد علاقہ، جنگل میں
مکان بنوا کر رہنے کا کیا مطلب ہے۔ صرف دو عورتیں
اتنے بڑے مکان میں کس طرح رہتی ہیں؟ تمہاری گذر
اوقات کس طرح ہوتی ہے؟''

یہ سُن کر ماں بیٹی کا دل بھر آیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک
پڑے۔ کماری تو خاموش رہی لیکن ضعیفہ نے دل سنبھال کر کہا:

''بیٹا! ہم دُنیا کے ستائے ہوئے ہیں۔ اس دُنیا
میں ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ دُکھ درد کا کوئی ساتھی
نہیں، نہ ہماری زندگی کی کوئی منزل ہے، صرف ایشور کا

بھروسہ ہے۔ وہی محافظ اور ہماری لاج رکھنے والا ہے۔
اسی کی کرپا سے ہم کو کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ اسی کے
بھجن اور عبادت میں ہمارا وقت اس سنسان جنگل میں
گذرتا ہے۔ بیٹا! ہم لوگ بیجاپور کے رہنے والے ہیں۔
ایک شریف برہمن خاندان کی یادگار ہیں۔ اس لڑکی کا
باپ علم جوتش کا بڑا عالم تھا۔ راج دربار میں وہ ایک اعلیٰ
عہدہ پر مامور تھے اور اُن کی بڑی عزّت تھی۔ اتفاق سے
ملک کے امیر سے کچھ جھگڑا ہوگیا۔ میرے پوجیہ سوامی
بڑے خوددار تھے۔ اپنے عہدے کی کچھ پروانہ کی۔ ہم
دونوں کو لے کر یہاں چلے آئے اور یہ مکان بنوا کر اس
سنسان جنگل کو آباد کیا۔ دُنیا والوں سے اُن کو کوئی دلچسپی
نہ رہ گئی تھی۔ وہ اپنا وقت ایشور کی یاد میں گزارتے تھے۔
مگر ظالم فلک سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ میرے پتی سرگباش
ہوگئے اور ہم دونوں مصیبت اُٹھانے کے لئے زندہ رہ
گئے۔ ہماری تمام جائداد تک امیر نے ضبط کرلی۔ ہم
اپنے ساتھ جو زیورات اور جواہرات لے آسکے انہیں کو بیچ
کر یہ مکان بنوایا اور جو نقدی تھی اُسی سے اب اپنی زندگی
بسر کر رہے ہیں۔

ایک دن ہم تینوں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ میرے پتی دیو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگے کہ ''افسوس اس بات کا ہے کہ میرا علم میرے ساتھ جائے گا۔ اگر پرماتما نے مجھے لڑکا دیا ہوتا تو میں اُسے اپنا علم سکھا جاتا۔'' میں بھی یہ سُن کر رو پڑی۔ یہ لڑکی جو تمھارے سامنے بیٹھی ہے اس وقت دس بارہ سال کی تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنچل سے آنسو پونچھ کر اُس کو چُپ کرایا۔ وہ یکبارگی اُٹھ کر اپنے پتا کے چرنوں پر گر پڑی۔ اور عاجزی کے ساتھ کہنے لگی: ''پتا جی میں پڑھوں گی۔ آپ مجھے پڑھائیے۔ باپ نے خوش ہو کر اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا: ''بیٹی روپ کشور میں تجھے ضرور پڑھاؤں گا۔'' بس اُسی دن سے وہ روپ کشوری کو پڑھانے لگے۔ تین چار سال کے اندر ہی اس نے کافی تعلیم حاصل کر لی۔ اپنی بیٹی کی لیاقت اور قابلیت پر میرے پتی بہت خوش ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب مجھے مرنے کا صدمہ نہیں رہا۔

ایک دن انہوں نے کہا کہ ''بیٹی روپ کشوری! جس مقام پر ہم لوگ رہتے ہیں اس کا لگن چکر تو بتاؤ۔ میں بھی بناتا ہوں۔ پھر دیکھوں گا کہ تم نے جوتش کا علم کتنا سیکھ لیا ہے۔'' باپ کا حکم سُن کر روپ کشوری نے ہنستے ہنستے تھوڑی دیر میں چکر بناڈالا۔ جب باپ نے اپنے چکر سے ملایا تو بیٹی کے چکر میں کچھ فرق نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میرے پتی کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔''

جہانگیر کو ضعیفہ کی دُکھ بھری داستان سُن کر بہت افسوس ہوا اور اُس نے پوچھا:

''ماں! جس مقام کا چکر بنایا گیا تھا اس کا پھل کیا تھا۔''

ضعیفہ نے جواب دیا:

''ابھی روپ کشوری نے بستہ سے جو کاغذ نکال کر رکھا ہے اس کے متعلق اس نے مجھ سے کہا تھا کہ امّاں! ایک دن یہاں ایک ایسا بلند اقبال شخص آئے گا جو مہاراجہ ہوگا۔ اس کا حلیہ بھی روپ کشوری نے مجھ کو بتایا تھا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے کیا کہا تھا کہ اس کی انگلی میں ایک بیش قیمت یاقوت کی انگوٹھی ہوگی۔ وہی ہمارا

مدد گار ہوگا اور ہماری پرورش کرے گا۔ ابھی روپ کشوری نے تمہارا ہاتھ دیکھا اور اسے وہ تمام نشانیاں مل گئیں جو مہاراجوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں لیکن تم تو خود کو ایک معمولی سوار بتاتے ہو جس کا مجھے یقین نہیں آتا۔ تمھارے چہرہ سے ایسا جلال ظاہر ہو رہا ہے کہ سامنے خود بخود سر جُھکانے کو جی چاہتا ہے۔ میں تم کو قسم دیتی ہوں کہ تم اپنا سچا حال بتاؤ۔ ہم بھی اپنے مدد گار کے منتظر ہیں۔ روپ کشوری اب جوان ہو رہی ہے۔ اب تک میں اس کی شادی کا کوئی انتظام نہ کر سکی۔ مجھ کو اپنی پروانہیں۔ لیکن روپ کشوری کا بہت خیال ہے، میں تو بوڑھی ہو چکی۔ آج مری کل دوسرا دن۔"

ضعفیہ کی باتوں نے شہنشاہ کے دل پر خاص اثر ڈالا، پھر بھی وہ نہ جانے کیوں اپنا حال بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بات ٹال کر وہ کہنے لگا:

"میں کوئی بھی ہوں، یہ پوچھ کر کیا کرو گی۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج سے روپ کشوری میری دھرم پتری اور تم میری دھرم ماتا ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ سب کا مالک اور مدد گار ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیٹی روپ

کشوری کو میری یہ انگوٹھی بہت پسند ہے۔ اب جب کہ میں
اس کو اپنی بیٹی بنا چکا ہوں یہ انگوٹھی بڑی خوشی سے بخشتا
ہوں۔''

یہ کہہ کر جہانگیر نے اپنی انگلی سے اگوٹھی اتار کر روپ کشوری کی انگلی میں پہنا دی
اور کہا: ''خدا تم کو یہ انگوٹھی مبارک کرے۔''

جہانگیر کی اس فیاضی کو دیکھ ضعیفہ نے کہا:

''مسافر! اول تو معمولی سواروں کو ایسی انگوٹھی
نصیب نہیں ہوتی اور اگر اتفاق سے ان کو مل بھی جائے تو وہ
اسے خوشی سے ہرگز کسی کو نہ دیں گے۔ یہ دل کلیجہ راجہ
مہاراجوں کا ہوتا ہے۔ معمولی آدمیوں کا دل اتنا فیاض
نہیں ہوتا۔''

یہ کہہ کر ضعیفہ نے مسافر کو آشیر باد دیا۔ اور بیٹی کو حکم دیا کہ وہ اپنے دھرم پتا کو
پرنام کرے۔ روپ کشوری جیوں ہی پرنام کرنے کو اُٹھی جہانگیر نے پیار سے
اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اب تک ماں بیٹی کو یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ واقعی
وہ مسافر کون ہے۔ اسی دوران میں انہوں نے بہت سے سواروں کو اپنی طرف
آتے دیکھا۔ قریب پہونچ کر ان سواروں کی نظر جب جہانگیر پر پڑی تو وہ

گھوڑے سے فوراً اُتر پڑے۔ فوجی قاعدے سے سلام کیا اور یکبارگی چلاّ اٹھے: ''شہنشاہ سلامت! شہنشاہ زندہ باد!'' تھوڑی دیر میں وہاں سینکڑوں سوار پہونچ گئے۔ یہ وہ سوار تھے جو شہنشاہ کو تلاش کرتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ ''شہنشاہ سلامت! شہنشاہ زندہ باد' کے نعروں سے جنگل گونج اُٹھا۔

اس نظارہ کو دیکھ کر ضعیفہ نے ہنس کر کہا:

> ''اوہو مسافر جی! اب آپ خود کو ہم سے چھپانے کی کیا ترکیب کریں گے؛ اب آپ میرے سرگ باشی پتی دیو کے علم کو کس طرح جھٹلائیں گے؟ ان سواروں میں کئی عہدہ دار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کسی معمولی سوار کے سامنے ایسے معزز عہدہ دار سر جھکا کر ادب سے سلام کر کے 'شہنشاہ سلامت' کا نعرہ لگاتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔''

اب تو شہنشاہ جہانگیر سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا:

> ''ماں! معاف کرو مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں جہانگیر ہوں۔''

یہ سُن کر روپ کشوری مسکرائی اور دوڑ کر گھر سے ایک مہر بند لفافہ لایا اور جہانگیر کو دے کر کہا:

''مہاراج! لیجئے۔ یہ خط میرے پتا جی نے آپ
کے لئے دیا تھا۔''

جہانگیر نے خط کھول کر پڑھا۔ خط فارسی میں لکھا تھا جس کا
خلاصہ تھا:

''مہاراجا دھیراج! میں آپ کو مبارک باد دیتا
ہوں کہ آپ دکن کی مہم میں کامیاب ہوں گے۔ اس کے
لئے آپ خدا کا شکرادا کیجئے۔ میری اس بچّی کی جو آپ کو
میرا خط دے گی سرپرستی فرمایئے گا۔ مجھے دلی افسوس ہے
کہ میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل نہ کرسکوں گا۔
شہنشاہ زندہ باد۔''

خط پڑھ کر جہانگیر نے کہا:
''ماں جی اور بیٹی روپ کشوری! تم اب کسی قسم کی
فکر نہ کرنا۔ خدا مددگار ہے، وہ ہم سب کی مدد کرے گا۔''
اتنا کہہ کرشہنشاہ جہانگیر نے اپنی چھاؤنی کی طرف چل دیا۔

جو روپ کشوری کبھی بیجاپور کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کی اکلوتی لڑکی
ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار میں پالی گئی تھی وہی گردش افلاک سے بن باسی بنی۔

دنیا میں ماں کے سوا اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے اوپر نیلہ آسمان اور آس پاس جنگلی جانوروں سے بھرا سنسان جنگل دیکھا کرتی تھی۔ وہ اپنا وقت خدا کی یاد، ماں کی خدمت اور گھر کے کام کاج میں گزارتی تھی۔ ماں بھی اپنی پیاری لڑکی کی صورت دیکھ کر جیتی تھی۔ جہاں تک اس سے ہوتا روپ کشوری کے آرام کا سامان مہیا کر دیا کرتی۔ کھانے پینے کی بھی کچھ تکلیف نہ تھی۔ پھر بھی روپ کشوری کی ماں کا دل فکر کی آگ سے کانچ کی بھٹی بنا ہوا تھا۔

رات کی تاریکی کو دن کی روشنی دور کر دیتی ہے۔ گرمی کی آگ سے جھلسا ہوا سنسار برکھا رت سے ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حال انسان کی زندگی کا ہے۔ وہ کبھی سکھ اور کبھی دُکھ کی آگ میں جلتا ہے اور پھر یہ بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ خدا کی قدرت سے جنگل کے رہنے والے شہر کے مالک بن جاتے ہیں۔ اس طرح انسان کو اپنی خواہشات کے خلاف ''دھوپ چھاؤں''، دکھ سکھ والے سنسار میں زندگی کی کٹھن منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر جاتے وقت اپنے پیچھے کچھ سواروں کو چھوڑ گئے۔ سواروں نے پالکیوں کا انتظام کیا اور ماں بیٹی کو بڑی عزّت اور آرام کے ساتھ دلّی پہونچا دیا۔ دونوں پالکیاں شاہی محل میں اتار دی گئیں۔ شہنشاہ اس سے پہلے ہی پہونچ کر اپنی پیاری بیگم ملکہ نور جہاں سے سب حال بتا چکے تھے۔ محل میں ملکہ نور جہان بیگم نے خود ماں اور بیٹی کا استقبال کیا اور

خلعت فاخرہ سے دونوں کی عزت بڑھائی اور ان کے لئے ایک خاص محل بخش دیا۔ کچھ دنوں کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے روپ کشوری کی ماں سے صلاح لے کر تال کوٹ کے ایک معزز برہمن خاندان میں روپ کشوری کی شادی کر دی۔ پھیرے کے وقت خود شہنشاہ جہانگیر، شہزادہ شاہجہاں اور سب درباری حاضر تھے۔ شہنشاہ جہانگیر نے ریاست تال کوٹ (کوٹہ) روپ کشوری کے جہیز میں بخش دی۔ اس وقت ریاست تال کوٹ پندرہ لاکھ کی تھی۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی پر پانچ لاکھ اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے بھی پانچ لاکھ کی جاگیریں اور بڑھادیں اور ان کا جزیہ بھی معاف کر دیا۔ اس طرح بن باسی یتیم روپ کشوری کے دن پھر گئے اور ایشور کی کرپا سے دُکھ کے دن سُکھ میں بدل گئے۔

ریاست تال کوٹ ایک تاریخی مقام ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کی عطا کی ہوئی سُرخ یاقوت کی انگوٹھی اب تک ریاست کے خزانہ میں محفوظ ہے۔ جب کوئی نیا راجہ گدّی پر بیٹھتا ہے تو وہ انگوٹھی راجہ کی انگلی میں پہنائی جاتی ہے۔ اس رسم کے بعد پھر انگوٹھی اُتار کر بڑی حفاظت سے خزانہ میں رکھ دی جاتی ہے۔

I مختصر سوالات:

1) جہانگیر فرصت کے وقت کیا کرتا تھا؟

2) جہانگیر جنگل میں بھٹک کر کہاں پہنچا؟

3) روپ کشوری کا باپ کون تھا؟

4) کنڈلی بنا کر روپ کشوری نے شہنشاہ سے کیا استدعا کی؟

5) جہانگیر کی فیاضی کو دیکھ کر ضعیفہ نے کیا کہا؟

II توضیحی سوالات:

1) روپ کشوری کی ماں کے کردار پر روشنی ڈالئے؟

2) روپ کشوری اور اس کی بوڑھی ماں نے جہانگیر کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مفصل لکھئے۔

3) دلی میں ماں اور بیٹی کا استقبال کس طرح ہوا؟

4) اس کہانی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجئے؟